یعنی

سورۂ کہف کا مطالعہ تفسیر
قرآن حدیث، قدیم تاریخ، جدید
معلومات اور حالات حاضرہ
کی روشنی میں

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

ترجمہ

مولانا محمد الحسنی ندوی

مجلس نشریات اسلام ۱-کے-۳ ناظم آباد ۱ کراچی

معرکۂ ایمان و مادیت

سورۂ کہف کا مطالعہ، تفسیر، قرآن، حدیث، قدیم تاریخ
جدید معلومات، اور حالات حاضرہ کی روشنی میں

تالیف

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

ترجمہ

مولانا محمد الحسنی ندوی

مدیر "البعث الاسلامی"

مجلسِ نشریاتِ اسلام ۱۔کے ۳۰ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد، **کراچی ۱۸**

نام کتاب	معرکۂ ایمان ومادّیت
تصنیف	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
کتابت	ظہیر احمد کاکوروی
طباعت	مولائی پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت	۱۶۰ صفحات

ٹیلیفون : ۶۶۰۱۸۱۷

اسٹاکسٹ : مکتبہ ندوہ قاسم سنٹر اُردو بازار کراچی فون ۲۶۳۸۹۱۷

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

معرکۂ ایمان
و
مادیت

عربی (پہلا ایڈیشن ۱۹۷۱ء) کویت

اردو (پہلا ایڈیشن ۱۹۷۲ء) لکھنؤ

انگریزی لکھنؤ

فہرست عنوانات کتاب

پیش لفظ

پیش نظر کتاب "معرکۂ ایمان و مادیت" راقم سطور کی عربی کتاب "الصراع بین الایمان والمادیۃ" کا اردو ترجمہ ہے، یہ کتاب ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۱ء) میں دار القلم، کویت، کی طرف سے شائع ہوئی، ترجمہ کی خدمت مصنف کی اکثر عربی کتابوں کی طرح اس کے برادر زادۂ عزیز مولوی محمد الحسنی ریڈ "البعث الاسلامی" نے انجام دی، آیات کا ترجمہ زیادہ تر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے "ترجمان القرآن" سے ماخوذ ہے، اسلئے کہ وہ ترجمہ کتاب کی زبان اور طرز تحریر سے زیادہ میل کھاتا تھا، جہاں ان کا ترجمہ نہیں ملا وہاں دوسرے تراجم قرآن مثلاً "تفہیم القرآن" مولانا سید ابوالاعلی مودودی، نیز حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ترجمہ سے مدد لی گئی ہے۔

یہ کتاب کس طرح وجود میں آئی، اور اس کے مضامین اور مطالب کس طرح ارتقار و تکمیل کی منزلوں سے گذرے، اس تفسیر و تشریح کی نوعیت کیا ہے، اس کے مضامین کے مآخذ کیا ہیں، اور کن حضرات کی تحقیقات اور غور و فکر سے اس میں مدد ملی، اسکا عصر حاضر

کے حالات سے کیا تعلق ہے، اوراس سورہ سے کیا رہنمائی اورروشنی حاصل ہوتی ہے، ان سب سوالات کا جواب آپ خود اس کتاب میں پائیں گے، اللہ تعالےٰ کی ذات سے امید ہے یہ کتاب اس سورہ کے علوم وحقائق پر غور کرنے اور قرآن مجید کے عام فہم و تدبر میں مدد دیگی، وماتوفیقی الا باللہ

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہؒ

رائے بریلی

۲۳ محرم ۱۳۹۲ھ

۱۰ مارچ ۱۹۷۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

سورۂ کہف سے میرا تعارف

جمعہ کے روز جن سورتوں کے پڑھنے کا شروع سے میرا معمول ہے، ان میں سورۂ کہف بھی شامل ہے[1]، حدیث نبوی کے مطالعہ کے دوران مجھے علم ہوا کہ اس میں سورۂ کہف پڑھنے اور اس کو یاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اور اس کو دجال سے

---

[1] یہ معمول دراصل میری والدہ صاحبہ مرحومہ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے، وہ ہمیشہ مجھے اس کی تاکید کرتی تھیں کہ جمعہ کے روز میں سورۂ کہف ضرور پڑھوں، وقتاً فوقتاً وہ میرا محاسبہ بھی کرتی رہتی تھیں کہ اس پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں؟ یہ سورہ مجھے اسی طرح پڑھتے پڑھتے یاد ہوگئی، والدہ مرحومہ خود حافظ قرآن تھیں اور اپنے دینی مطالعہ اور ثقافت میں بھی ممتاز تھیں، اللہ تعالےٰ نے ان کو شاعری کا بھی بہت اچھا اور پاکیزہ ذوق عطا فرمایا تھا، ان کی مناجاتوں، دعاؤں اور درود و سلام کے مجموعے ان کے یقین و اعتماد اور سوز دل کے ترجمان ہیں، اور شعری محاسن سے بھی خالی نہیں جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۸۸ھ میں انتقال فرمایا،

حفاظت کا ذریعہ بتایا گیا ہے[۱] میں نے اپنے دل میں سوچا کہ کیا اس سورہ میں واقعی ایسے معانی و حقائق اور ایسی تنبیہیں یا تدبیریں ہیں جو اس فتنہ سے بچا سکتی ہیں جس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود بار بار پناہ مانگی ہے، اور اپنی امت کو بھی اس سے پناہ مانگنے کی سخت تاکید فرمائی ہے[۲] اور جو وہ سب سے بڑا آخری فتنہ ہے جس کے بارہ میں حضورؐ کا ارشاد یہ ہے کہ "ما بین خلق آدم الیٰ قیام الساعۃ امر اکبر من الدجال" (آدم کی پیدائش سے قیام قیامت تک دجال سے بڑا کوئی واقعہ نہیں ہے[۳])

---

[۱] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس نے سورۂ کہف اس طرح پڑھی جس طرح وہ نازل ہوئی اس کے بعد دجال ظاہر ہوا تو وہ اس پر قابو نہ پاسکے گا یا اس کو قابو میں لانے کا کوئی راستہ اسکو نہ مل سکے گا" (مستدرک للحاکم) ابن مردویہ اور محدث ضیائے مختارہ میں حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو ہر جمعہ کو سورۂ کہف پڑھے گا وہ آٹھ دن تک فتنہ سے محفوظ رہے گا اور اگر دجال نکلا تو اس کے فتنہ سے بھی مامون رہے گا" حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو سورۂ کہف کی دس پہلی آیتیں (ایک دوسری روایت میں آخری دس آیتوں کا ذکر ہے) پڑھے گا وہ دجال مسیح کے فتنہ سے محفوظ رہے گا" (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، آخرالذکر نے تین آیتوں کا ذکر کیا ہے) مسند احمد میں ہے کہ "جو سورۂ کہف کی آخری دس آیتیں پڑھے گا وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا" (ج ۶ صـ۴۴۶ ـ صـ۴۴۹) نسائی میں ہے کہ "جو سورہ کہف کی دس آیتیں پڑھے گا وہ اس کے لئے دجال سے امن و حفاظت کا ذریعہ بنیں گی" (اس مضمون کی بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں) [۳] صحیح مسلم (روایت عمران بن حصینؓ)

میں نے سوچا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے (جو کتاب اللہ اور اسکے اسرار و علوم سے سب سے زیادہ واقف تھے) قرآن کی ساری سورتوں میں آخر اسی سورہ کا انتخاب کیوں فرمایا ہے؟

عہد آخر کے فتنوں سے سورۂ کہف کا تعلق

مجھے محسوس ہوا کہ میرا دل اس راز تک پہونچنے کے لئے بیتاب ہے، میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس خصوصیت کا سبب کیا ہے، اور اس حفاظت اور بچاؤ کا جس کی خبر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، سورہ سے کیا معنوی تعلق ہے؟

قرآن مجید میں چھوٹی بڑی (قصار مفصل اور طوال مفصل) ہر طرح کی سورتیں موجود تھیں کیا وجہ ہے کہ ان سب کو چھوڑ کر اس سورہ کا انتخاب کیا گیا اور یہ زبردست خاصیت صرف اسی سورہ میں رکھی گئی[1]۔

---

[1] بہت سے علماء راسخین اور صف اول کے محدثین و مفسرین نے اسی طرز فکر اور مسلک کو اختیار کیا ہے اور اس پر غور کرنیکے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اس سورہ کا دجالی فتنہ سے خاص معنوی تعلق ہے علامہ محمد طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ) نے مجمع بحار الانوار میں بعض متقدمین سے یہ قول نقل کیا ہے کہ "حدیث میں سورۂ کہف کی دجال سے حفاظت کے معاملہ میں بڑی فضیلت آئی ہے، جو آخری زمانہ میں نکلے گا، جس طرح اصحاب کہف کی اس ظالم بادشاہ سے حفاظت ہوئی یا پھر اس دجال سے جو فریب و ملمع سازی اور تلبیس سے کام لیتا ہو اسکی وجہ وہ عجیب معاملات اور نشانیاں ہیں، جو اسکی آیات میں پوشیدہ ہیں جو اس میں تدبر سے کام لیگا وہ کسی فتنہ میں گرفتار نہ ہوگا" وہ کہتے ہیں "میرے نزدیک اس کا یہ امتیاز کسی ایسی خاصیت اور تاثیر کی وجہ سے ہے جس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم واقف تھے" (مجمع بحار الانوار، مادہ "دجل")

مجملاً مجھے اس کا یقین ہوگیا کہ یہ سورہ قرآن کی ضرور ایسی منفرد سورہ ہے جس میں عہد آخر کے ان تمام فتنوں سے بچاؤ کا سب سے زیادہ سامان ہے جس کا سب سے بڑا علمبردار دجال ہوگا، اس میں اس تریاق کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے جو دجال کے پیدا کردہ زہریلے اثرات کا توڑ کر سکتا ہے، اور اس کے بیمار کو مکمل طور پر شفایاب کر سکتا ہے، اور اگر کوئی اس سورہ سے پورا تعلق پیدا کرلے اور اس کے معانی کو اپنے جان و دل میں اتار لے (جس کا راستہ اس سورہ کا حفظ اور کثرت تلاوت ہے) تو وہ اس عظیم اور قیامت خیز فتنہ سے محفوظ رہے گا اور اس کے جال میں ہرگز گرفتار نہ ہوگا۔

اس سورہ میں ایسی رہنمائی، واضح اشارے بلکہ ایسی مثالیں اور تصویریں موجود ہیں جو ہر عہد میں اور ہر جگہ دجال کو نامزد کر سکتی ہیں، اور اس بنیاد سے آگاہ کر سکتی ہیں، جس پر اس کا فتنہ اور اس کی دعوت و تحریک قائم ہے، مزید برآں یہ کہ یہ سورہ ذہن و دماغ کو اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے تیار کرتی ہے، اور اس کے خلاف بغاوت پر اکساتی ہے، اس میں ایک ایسی روح اور اسپرٹ ہے جو دجالیت اور اسکے علمبرداروں کے طرز فکر اور طریقۂ زندگی کی بڑی وضاحت اور قوت کیساتھ نفی کرتی ہے اور اس پر سخت ضرب لگاتی ہے۔

سورہ کا صرف ایک موضوع ہے

اجمالی طور پر اس ذہن و خیال کو لے کر میں اس سورہ کی طرف اس طرح متوجہ ہوا، جیسے وہ میرے لئے بالکل نئی ہے میں یہ چراغ (یعنی اس سورہ کے

متعلق میرے ابتدائی ذہنی نقوش) لے کر اس کے مضامین ومشتملات کی جستجو میں نکل پڑا، اس وقت میں نے محسوس کیا کہ وہ معانی وحقائق کا ایک نیا عالم ہے جس سے میں اب تک نا آشنا تھا، میں نے دیکھا کہ پوری سورہ صرف ایک موضوع پر مشتمل ہے جس کو میں "ایمان ومادیت کی کشمکش" یا "غیبی قوت اور عالم اسباب" سے تعبیر کرسکتا ہوں، اس میں جتنے اشارے، حکایات وواقعات اور مواعظ اور تمثیلیں گزری ہیں، وہ سب انھیں معانی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کبھی کھل کر کبھی درپردہ۔

مجھے اس نئی دریافت یا نئی فتح سے بڑی مسرت حاصل ہوئی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید کے اعجاز کا ایک نیا پہلو میرے سامنے آیا، مجھے اس کا اندازہ نہ تھا کہ یہ کتاب جو چھٹی صدی عیسوی میں (یعنی آج سے تیرہ سو برس سے بھی زیادہ پہلے) نازل ہوئی اس دجالی تمدن وتہذیب کی (جو سترہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی اور بیسویں صدی میں پک کر تیار ہوئی) نیز اس کے نقطہ عروج اور اختتام اور اس کے رہبر اعظم کی (جس کو نبوت کی زبان میں "دجال" کہا گیا ہے) ایسی سچی اور بولتی ہوئی تصویر انسانوں کے سامنے پیش کردے گی۔

آج سے تقریباً ۲۵ سال قبل جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاذِ تفسیر تھا یہ مضامین ومعانی ایک مقالہ کی شکل میں میرے قلم سے نکلے اور رسالہ "ترجمان القرآن" میں شائع ہوئے جو اس زمانہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ادارت میں حیدرآباد سے نکلتا تھا، اسی زمانہ میں مجھے مولانا سید مناظر احسن گیلانی

رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ دینیات کے صدر تھے قیام کا موقع ملا، یہ ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۶ء) کی بات ہے، میرا ہر رات کو مولانا سے علمی مذاکرہ ہوتا، انھوں نے ذکر کیا کہ یہ مختصر مضمون ان کی نظر سے گزرا ہے، ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود اس موضوع پر (حسب معمول) بہت تفصیل کیساتھ لکھ رہے ہیں، اور اس کو اشاعت کے لئے "الفرقان" میں بھیجیں گے، مولانا کے انتقال کے موقع پر جب "الفرقان" کا ضخیم نمبر شائع ہوا تو یہ طویل مقالہ پورا اس میں شامل تھا۔

اس مقالہ نے جو اتنے زمانہ کے بعد شائع ہوا اس سورہ پر دوبارہ غور کرنے اور کچھ لکھنے کی تحریک پیدا کردی، اور یہ خیال ہوا کہ اس عظیم اور اہم سورہ کا عہدِ آخر کے فتنوں، تحریکوں، دعوتوں فلسفوں اور فکری رجحانات اور خاص طور پر دجالی فتنہ سے جو تعلق ہے اس پر روشنی ڈالی جائے اور اس کے اندر جو عبرتیں، اسباق، نشانیاں اور علامات پوشیدہ ہیں ان کی طرف توجہ دلائی جائے چنانچہ اس سلسلہ میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا میں نے اس کو قلمبند کرنا شروع کیا، مولانا گیلانی (جن کی باقاعدہ شاگردی کی سعادت سے میں محروم رہا لیکن ان کو اپنے اساتذہ و شیوخ میں سمجھتا رہا، اور وہ بھی ہمیشہ مجھے اپنا ایک عزیز بھائی سمجھتے رہے اور بہت شفقت و تعلق کا معاملہ فرماتے رہے) کے اس مقالہ میں نکات علمی، بلیغ اشارات اور لطائف قرآنیہ کا جو قیمتی ذخیرہ تھا، اس سے مجھے بڑی مدد ملی، اس سورہ کے بارہ میں جو کچھ آگے آرہا ہے وہ مفسرین کے مخصوص طریقہ پر نہیں لکھا گیا ہے بلکہ صرف تاثرات اور واردات کا مرقع اور سورۂ

کھٹ کا ایک عمومی اور اصولی جائزہ ہے۔

دجال کی شخصیت کی کلید

دجال کی شخصیت کی وہ کلید جس سے اس کے سارے بند قفل کھل جاتے ہیں، اور اس کی گہرائیاں بھی سطح آب پر آجاتی ہیں، اور جو اس کو شر و فساد اور کفر و الحاد کے دوسرے تمام علمبرداروں میں نمایاں کرتی ہے وہ یہی "دجالؔ"[1] کا مخصوص لقب اور وصف ہے جو اس کی پہچان اور علامت بن گیا ہے، دجل اور دجالیت ایسا محور ہے جس کے گرد اس کی پوری شخصیت اور اس کے تمام پروگرام، مظاہر، سرگرمیاں اور اعمال گردش کر رہے ہیں، اور اس کے ہر فعل پر اس کا سایہ ہے،

---

[1] ابن منظور نے لسان العرب میں لکھا ہے کہ الداجل کے معنی جعلساز اور جھوٹے کے ہیں اور اسی سے دجال بنایا گیا ہے، دجال کو مسیح کذاب بھی کہا گیا ہے اس لئے کہ اس کا دجل اس کا جھوٹ اور سحر ہے، ابن خالویہ کہتے ہیں کہ دجال کی تشریح کسی نے اتنی اچھی نہیں کی جتنی ابو عمرو نے .... انھوں نے کہا کہ دجال جعلساز اور ملمع ساز کو کہتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ دجلت السیف یعنی تم نے تلوار پر ملمع سازی کی اور اس پر سونے کا پانی چڑھا دیا، ازہری کہتے ہیں کہ ہر کذاب دجال ہے، دجل کسی نقلی چیز پر سونے کا پانی چڑھانے کو کہتے ہیں، چنانچہ اسی لئے سونے کے پانی کو بھی دجال کہتے ہیں، دجال کو اس سے تشبیہ اس لئے دی گئی کہ وہ ظاہر کچھ کرے گا، اندر کچھ ہوگا، ابو العباس کہتے ہیں، دجال اس کو اس لئے کہا گیا کہ وہ لوگوں کو فریب میں ڈالے گا اور باطل کو خوشنما و آراستہ کرکے پیش کرے گا،

(لسان العرب باختصار)

عہد حاضر کی مادی تہذیب کا بھی سب سے بڑا حربہ یہی ملمع سازی اور فریب کاری ہے[1] اور اس کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس نے کسی چیز کو اسکے اثر سے آزاد نہیں چھوڑا، حقائق کچھ اور ہوتے ہیں، نام ان کے برعکس رکھے جاتے ہیں، اصطلاحات اور پرشکوہ الفاظ کا بکثرت رواج ہے، ظاہر و باطن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں، آغاز و انجام، تمہید و اختتام، علمی نظریات اور عملی تجربوں میں یکسانیت کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، یہی حال ان فلسفوں اور نعروں کا ہے، جنھوں نے مذاہب کی جگہ لے لی ہے، اور انسانوں کے دل و دماغ کو مسحور کر رکھا ہے[2] اس کے زعماء کے اقوال و بیانات کے گرد تقدیس کا ایک ہالہ قائم کر دیا گیا ہے، اور ان کی عقیدت و محبت دل میں تہ نشین ہو چکی ہے، ان کے افکار و خیالات کی برتری و بالاتری اور عصمت و تقدس میں شبہ کرنا رجعت پسندی کی علامت، امر بدیہی اور محسوس و مشہور چیز کا انکار سمجھا جاتا ہے اور بڑے بڑے ذہین و ذکی، اعلیٰ درجہ کے اہل علم اور غیر معمولی صلاحیت کے اہل فکر و نظر بھی اس معاملہ میں مغالطہ اور فریب نظر کا شکار رہیں ہیں اور وہ بھی ان فلسفوں اور تحریکوں کے گن گانے لگے ہیں، اور

---

[1] حذیفہ بن الیمان سے مروی ہے کہ "دجال اس طرح نکلے گا کہ اسکے ساتھ آگ اور پانی ہوگا، جسکو لوگ پانی سمجھیں گے وہ جلانے والی آگ ہوگی، جسکو آگ سمجھیں گے وہ شیریں پانی ہوگا" (مسلم کتاب الفتن واشراط الساعۃ) حضرت ابو ہریرۃ سے روایت ہے کہ "اسکے ساتھ جنت و دوزخ کی طرح کوئی چیز ہوگی جسکو وہ جنت بتائیگا وہی دراصل دوزخ ہوگی،،

[2] مثلاً حریت، اشتراکیت، جمہوریت، معیار زندگی کی بلندی، معاشی خوشحالی، فلاحی ریاست، انسانی حقوق، یہانتک کہ تمدن و تہذیب، فنون لطیفہ اور قانون و دستور جیسے الفاظ صرف نعرے کے طور پر استعمال کئے جا رہے ہیں۔

ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں، وہ اس کے علمبرداروں اور لیڈروں کے جذبۂ اخلاص اور صداقت کا امتحان لئے بغیر بڑے یقین و گرمجوشی کے ساتھ اس کے داعی بن چکے ہیں، اور اخلاقی جرأت کے ساتھ ان کی کامیابی اور ناکامی کا حساب لگائے بغیر اور ان نظریات کے نتیجہ میں انسانیت کے نفع و نقصان کا غیر جانبدارانہ اور صحیح جائزہ لئے بغیر اس کے ہمنوا اور ہم آواز ہیں، اور یہ دیکھنے کے روادار نہیں کہ ان تحریکوں کے نتیجہ میں حقیقی کامیابی اور فطری حقوق انسانیت کو حاصل ہوتے بھی ہیں، یا نہیں؟ یہ سب اسی دجل و فریب کا اثر اور سحر ہے جس میں "دجال اکبر" اپنے پیشرو چھوٹے دجالوں، فریب کاروں اور ملمع سازوں سے آگے ہوگا، خواہ وہ تاریخ کے کسی دور میں گزرے ہوں۔

یہ دجالی اور پر فریب روح اس تہذیب میں اس وجہ سے داخل ہوئی اور سرایت کر گئی کہ اس نے بھی نبوت، آخرت، غیب، خالق کائنات اور اسکی قدرتِ کاملہ پر ایمان اور اس کی شریعت و تعلیمات کا بالکل مخالف رخ اختیار کیا، حواس ظاہری پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کیا اور صرف ان چیزوں سے دلچسپی رکھی جو انسان کو جسمانی لذت، فوری منفعت اور ظاہری عروج و غلبہ سے ہمکنار کر سکیں، اور یہی وہ نقطہ ہے جس پر سورۂ کہف میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس میں جتنے عبرت انگیز واقعات و حقائق گزرے ہیں وہ اسی مرکزی نقطہ سے وابستہ ہیں، اور ایک لڑی میں پیوست ہیں۔

تہذیب و تمدن کی تشکیل اور انسانیت کی رہنمائی میں عیسائیت و یہودیت کا ملتا جلتا کردار

ہمیں افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کرنا پڑے گا، کہ عیسائیت (جس نے

قرون مظلمہ کے بعد یورپ کی قیادت کی) اور جذبۂ انتقام میں سرشار باغی یہودیت کا کردار (عقائد میں بنیادی اختلاف کے باوجود) بہت ملتا جلتا رہا ہے، اور یہ دونوں مذاہب تہذیب انسانی کا رخ ایسی مکمل اور انتہا پسندانہ مادیت کی طرف پھیرنے میں (جو انبیاء کی تعلیمات اور روحانیت سے بالکل آزاد ہو) اور انسانیت کے مستقبل پر اثر انداز ہونے میں برابر کے شریک کار اور ذمہ دار رہے، عیسائی اقوام نے جو کلیسا اور یورپ کی بالادستی سے آزاد ہو چکی تھیں، اور جن کا رشتہ اصلی عیسائیت سے (جو صلح پسند اور توحید خالص کی داعی تھی) اگر منقطع نہیں، تو کمزور ضرور ہو گیا تھا یہ تیز رو اور انتہا پسندانہ مادی رخ اختیار کیا، اور بالآخر جدید علمی انکشافات اور تباہ کن ایجادات کے نتیجہ میں پوری دنیا اور انسانیت ایک عظیم خطرہ سے دوچار ہے، اور علم و جذبات، عقل و ضمیر اور صنعت و اخلاق کے درمیان توازن اور ضروری تناسب یکسر مفقود ہو چکا ہے۔

عہد آخر میں یہودیوں نے (مختلف اسباب کی بنا پر جن میں بعض ان کے نسلی خصائص سے تعلق رکھتے ہیں، بعض تعلیم و تربیت سے، بعض سیاسی مقاصد اور قومی منصوبوں سے) علم و فن اور ایجادات و اختراعات کے میدان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، انھوں نے ایک طرح سے تہذیب جدید پر پورا کنٹرول کر لیا اور ادب و تعلیم، سیاست و فلسفہ، تجارت و صحافت اور قومی رہنمائی کے سارے وسائل انکے ہاتھ میں آ گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے مغربی تہذیب (جو مغربی ماحول میں پیدا ہوئی) کے ایک اہم ترین عنصر کی حیثیت حاصل کر لی، جدید تغیرات کا جائزہ لینے سے ہمیں اندازہ ہو گا کہ بین الاقوامی یہودیت کا اثر در سوخ مغربی معاشرہ میں

کس قدر بڑھ چکا ہے، اب یہ تہذیب اپنے تمام سرمایۂ علم و فن کے ساتھ اپنے منفی انجام کی طرف بڑھ رہی ہے، اور تخریب و فساد اور تلبیس و دجل کے آخری نقطہ پر ہے، اور یہ سب ان یہودیوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے، جن کو اہلِ مغرب نے سر آنکھوں پر بٹھایا اور ان کے دوررس خفیہ مقاصد، انتقامی طبیعت اور تخریبی مزاج سے غافل و بے پرواہ ہو کر ان کی جڑوں کو اپنے ملکوں میں خوب پھیلنے اور گہرا ہونے کا موقع دیا اور ان کے لئے ایسی سہولتیں اور مواقع فراہم کئے جو طویل صدیوں سے ان کے خواب و خیال میں کبھی نہ آسکے ہوں گے، یہ انسانیت کا سب سے بڑا ابتلاء ہے، اور نہ صرف عربوں کے لئے (جو ان کو بھگت رہے ہیں، اور نہ صرف اس محدود رقبہ کے لئے جہاں موت و زیست کی یہ کشمکش برپا ہے) بلکہ ساری دنیا کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

غالبًا ان ہی وجوہ کی بنا پر اس سورہ کا عیسائیت و یہودیت سے گہرا تعلق ہے، بلکہ سورہ کا آغاز ہی عقیدۂ عیسائیت کے ذکر سے ہو رہا ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی	ساری ستائشیں اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے بندے
عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ	پر الکتاب اتاری (یعنی قرآن اتارا) اور
عِوَجًا ۝ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا	اس میں کسی طرح کی بھی کجی نہ رکھی، بالکل سیدھی
مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ	بات! (ہر طرح کے پیچ و خم سے پاک!) اور اس لئے
يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ	اتاری کہ لوگوں کو خبردار کردے، اللہ کی جانب
اَجْرًا حَسَنًا ۝ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝	سے ایک سخت ہولناکی (ان پر) آسکتی ہے،
وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ	اور مومنوں کو جو اچھے اچھے کام کرتے ہیں،

وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا[له]

خوش خبری دیدے کہ یقیناً ان کے لئے بڑی ہی خوبی کا اجر ہے، ہمیشہ اس میں خوش حال رہیں گے۔

نیز ان لوگوں کو متنبہ کردے جنھوں نے (ایسی سخت بات منھ سے نکالی کہ) کہا اللہ بھی اولاد رکھتا ہے! اس بارے میں انھیں کوئی علم نہیں، نہ ان کے باپ دادوں کے پاس کوئی علم تھا، کیسی سخت بات ہے جو ان کی زبانوں سے نکلتی ہے! یہ کچھ نہیں کہتے، مگر سرتاسر جھوٹ!

اس تہذیب کی جو عیسائیت کی گود میں پلی اور بڑھی اور اس کی سرپرستی میں پروان چڑھی، دوسری پہچان یا خصوصیت اس محدود و فانی زندگی سے حد سے بڑھا ہوا تعلق، اس کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور طویل بنانے کا شوق، اس کی عظمت میں غلو و مبالغہ اور اس کے سوا تمام اخلاقی قدروں، عظمتوں اور نعمتوں کی نفی، اور مادی اسباب و وسائل اور ذخائر پر قبضہ و اقتدار پر انحصار اور اس میں مکمل انہماک اور استغراق ہے، یہ وہ نقطہ ہے، جہاں یہودیت اپنی ساری عیسائیت دشمنی اور رقابت کے باوجود اس کے ساتھ آکر شریک ہو گئی ہے۔

توریت بھی اخروی زندگی پر یقین اور اس کے لئے تیاری، عالم آخرت

[له] سورہ کہف ۱ تا ۵

کی ابدی سعادت کے حصول کے لئے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے استعمال، اور جنت کی نعمتوں اور خدا کے انعامات کا ذوق و شوق پیدا کرنے والی چیزوں کے بیان، اس دنیا کی بے حقیقتی اور عمر کی بے ثباتی کی تشریح، اقتدار پرستی اور توسیع پسندی کے جذبہ کی مذمت، زمین میں تخریب و فساد کی ممانعت، زہد و قناعت اور دنیا و متاع دنیا سے کم سے کم وابستگی کی دعوت سے اس طرح خالی ہے کہ حیرت ہوتی ہے، اس کا طرز ان آسمانی صحیفوں کے طرز سے بالکل جدا نظر آتا ہے، جو خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، اور جن کی اصل روح محبتِ دنیا کی مذمت اور آخرت کی دعوت ہے۔

اس لحاظ سے اگر یہودیت کی تاریخ صرف مادی قوت، رقابت و مسابقت، دولت کی ہوس، نسلی غرور، اقتدار پرستی اور قومی تکبر کی تاریخ میں ڈھل گئی ہے، تو تعجب نہ ہونا چاہیئے، یہ ذہنیت یہود کی مذہبی کتابوں، ان کے ادب و لٹریچر، انکی ایجادات واختراعات ان کے انقلابات و تحریکات اور افکار و خیالات ہر چیز سے عیاں ہے، اور نرم دلی، تواضع، ضبط نفس، خود شکنی، دنیاوی زندگی سے بے رغبتی، اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق، آخرت کی طلب اور انسانیت پر رحم و شفقت کا کوئی شائبہ ان کے قومی نظام میں نہیں پایا جاتا۔

اسی وجہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس سورہ میں شرک اور فرزندی کے عقیدہ کی جو عیسائیت کی طرف منسوب ہے سخت مذمت فرمائی ہے اور دنیاوی زندگی کی پرستش، اس کو ہمیشہ کا گھر سمجھنے، اور ہر چیز سے کٹ کر اس میں مست و بیخود رہنے پر سخت تنبیہ کی ہے اور اس کی بنیادی کمزوری اور بے ثباتی کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝ وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ۝[1]

روئے زمین میں جو کچھ بھی ہے اسے ہم نے زمین کی خوشنمائی کا موجب بنایا ہے، اور اسلئے بنایا ہے کہ لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں، کون ایسا ہے جس کے کام سب سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں، اور پھر ہم ہی ہیں کہ جو کچھ زمین پر ہے اسے (نابود کرکے) چٹیل میدان بنا دیتے ہیں

دنیا کے پرستاروں، منکرین آخرت اور اہل غفلت پر نکیر کرتے ہوئے ارشاد ہے،

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝[2]

(اے پیغمبر!) تو کہدے "ہم تمہیں خبر دیدیں، کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہوئے؟ وہ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں، اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کارخانہ بنا رہے ہیں!"

اسی طرح عقیدۂ آخرت، ایمان بالغیب اور خالق کائنات اور اس کی قدرت کاملہ پر ایمان، سورہ کے اول و آخر بلکہ اس کے تمام حصوں پر محیط ہے، یہ وہ عقیدہ نفسیات، عقلیت اور مزاج ہے، جو مادیت کے مزاج و نفسیات سے یکسر مختلف ہے، اس کے برعکس مادیت (جو صرف حس، مشاہدہ اور تجربہ پر اعتماد کرتی ہے، اور دنیاوی منفعت، جسمانی لذت اور قومی و نسلی سیادت و برتری کی قائل ہے)

---

[1] سورہ کہف ۷-۸ [2] ایضاً ۱۰۳-۱۰۴

اس سے ابا کرتی ہے اور اس سے متنفر ہے، بلکہ اپنی پوری قوت وصلاحیت کے ساتھ اس سے برسرپیکار ہے، یہ سورہ جس مادہ اور جوہر پر مشتمل ہے اس کے اندر اس مادیت کا تریاق پہلے سے موجود ہے، جو تقدیر الٰہی سے سب سے زیادہ عیسائیوں کے حصہ میں آئی اور پوری تاریخ میں وہ اس کے سب سے بڑے سرپرست داعی اور نگراں و ذمہ دار ثابت ہوئے، اس کے بعد اس کی تولیت و قیادت یہود کے ہاتھ میں رہی جو حضرت مسیح کے شروع سے دشمن اور ہر دور میں مسیحیت کے رقیب تھے، اور اب ان ہی یہودیوں کے ہاتھوں یہ تہذیب اپنی آخری بلندیوں تک پہونچے گی اور ان ہی میں "دجال اکبر" ظاہر ہوگا جو کفر و الحاد اور دجل و تلبیس کا سب سے بڑا علمبردار اور سارے دجالوں کا سردار ہوگا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس سورہ اور خاص طور پر اس کے ابتدائی حصہ کی تلاوت اس کے فتنہ سے محفوظ رکھتی ہے، اس طرح سورہ کے آغاز و اختتام کے درمیان ایک ایسی لطیف مناسبت قائم ہوگئی ہے جس کو ہر شخص محسوس کرسکتا ہے، مجموعی طور پر سورہ کا تعلق فتنۂ دجال سے بہت گہرا ہے اور اس کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔

سورۂ کہف کے چار قصے

یہ سورہ چار قصوں پر مشتمل ہے جو اس کے سنگ میل یا ستون کہے جاسکتے ہیں، دوسرے الفاظ میں یہ وہ محور ہیں جن کے گرد اس کی ساری تعلیم و موعظت اور دانش و حکمت گردش کر رہی ہے

۱۔ اصحابِ کہف کا قصہ ۔
۲۔ صاحب الجنتین (دو باغ والے) کا قصہ
۳۔ حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کا قصہ ۔
۴۔ ذوالقرنین کا قصہ ۔

یہ قصے جو اپنے اسلوبِ بیان اور سیاق و سباق کے لحاظ سے جدا ہیں مقصد اور روح کے لحاظ سے ایک ہیں، اور اس روح نے ان کو معنوی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور ایک لڑی میں منسلک کر دیا ہے۔

کائنات کے دو نظریئے!

یہ کائنات (عام حالات میں) طبعی اسباب و محرکات کی تابع ہے اور یہ اسباب اس میں اپنا کام کر رہے ہیں، یہ وہ کائناتی طاقتیں ہیں جو اس کے نظام پر حاوی اور اس کے اندر جاری و ساری ہیں، یہ اسباب اور خواصِ اشیاء کبھی شاذ و نادر ہی اپنی خاصیت و تاثیر چھوڑتے ہیں، یا ان کا نشانہ غلط ہوتا ہے، اب لوگوں کی ایک تعداد وہ ہے، جن کی نگاہ ان ظاہری اور قدرتی اسباب سے پیچھے نہیں گئی بلکہ اسی زندگی اور مادی اور محسوس دنیا میں اٹک کر رہ گئی، وہ سمجھنے لگے کہ نتائج ہمیشہ اسباب ہی سے وجود میں آسکتے ہیں، اور اسباب کے بغیر نتائج کا تصور ناممکن ہے، اور پوری کائنات میں کوئی ایسی طاقت نہیں جو اسباب و نتائج کے درمیان حائل ہو سکے اور اپنے آزادانہ ارادہ کے ساتھ ان میں کوئی تبدیلی کر سکے اور بغیر اسباب کے مسببات کو وجود میں لا سکے اور ان کو بلا کسی تمہید، مدد اور سہارے کے پیدا کر سکے،

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ گروہ ان اسباب ظاہری میں پھنس کر رہ گیا اور ان کے ساتھ اس نے خدا کا سا معاملہ کرنا شروع کر دیا، اشیاء کی خاصیتوں اور اسباب و وسائل کے سوا اس نے ہر چیز سے انکار کیا، اس نے اس قوت کا انکار کیا جو اس کائنات کی بلا شرکتِ غیرے مالک و حاکم ہے اور اس کا حکم ساری دنیا پر نافذ ہے، اس زندگی کے بعد دوسری زندگی، اور حشر و نشر کا بھی اس نے انکار کیا اور اپنی ساری قوت و صلاحیت کائنات کی ان طبعی طاقتوں کی تسخیر اسباب و خواص کی دریافت، اور مادی وسائل کے استعمال میں صرف کر دی، اور اس کی فکر و آرزو اور تلاش و جستجو میں سرگرداں رہا یہاں تک کہ ان چیزوں کی عظمت اور محبت اس کے رگ و ریشہ میں پیوست ہوگئی، اور اس کو اس نے اپنا رب اور اپنا معبود بنا لیا، مادہ اور قوت کے سوا وہ ہر چیز کا منکر ہوگیا، جب مقصد کی تکمیل اسکو آنکھوں سے نظر آنے لگی اور اس نے بعض چیزوں کو اپنے ارادہ کے تابع کر لیا اور اپنے تصرف و استعمال میں لے آیا تو اس نے کبھی زبان حال سے اور کبھی زبان قال سے اپنی الوہیت و ربوبیت کا بھی اعلان کرنا شروع کیا اپنے جیسے انسانوں کو اپنا بندہ اور غلام بنایا، ان کے خون، مال اور عزت و آبرو کے ساتھ جس طرح چاہا کھیل کھیلا، اور اپنے اغراض و خواہشاتِ نفسانی اور اپنی سربلندی و ناموری کے لئے یا اپنی قوم کی عظمت کے نام پر، وطن کے نام پر اور پارٹی کے نام پر ان مظلوم انسانوں کے ساتھ جو چاہا سلوک کیا

اس کائنات کا دوسرا نظریہ پہلے نظریہ سے بنیاد اور طریقۂ کار ہر چیز میں مختلف ہے، یہ نظریہ اس یقین پر قائم ہے کہ ان طبعی اسباب، قدرتی طاقتوں

اور خزانوں اور اشیار کی خاصیتوں سے ماوراا ور بالاتر ایک غیبی قوت ہے، جسکے ہاتھ میں ان اسباب و خواص کی زمام اقتدار ہے، اور جس طرح نتائج و ثمرات اسباب کے تابع ہیں، اسی طرح خود یہ اسباب اللہ تعالیٰ کے ارادہ و مشیت اور حکم و اشارہ کے تابع محض ہیں، ارادۂ الٰہی ان کو عدم سے وجود میں لاتا ہے ان کو آگے بڑھاتا اور چلاتا ہے، اور جب چاہتا ہے ان کو مسببات سے جدا کر دیتا ہے، اس لئے کہ اسباب و مسببات دونوں یکساں طریقہ پر اس کے تابع و فرمانبردار ہیں، وہ خود مسبب الاسباب اور علۃ العلل ہے، اور اسباب اور علل کا سارا سلسلہ اسی کی ذاتِ عالی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔

کائنات کو پیدا کرنے اور اسباب کو وجود میں لانے کے بعد کائنات کی زمام ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی، اور سلسلۂ اسباب اس کی غلامی سے ایک لمحہ کے لئے آزاد نہیں ہوا، نہ اس نے اس سے سرتابی کی، نہ کبھی اسکے خلاف علم بغاوت بلند کیا، آسمان و زمین کی کوئی چیز اس کو عاجز کرنے پر قادر نہیں اسی نے اپنی حکمتِ بالغہ اور ارادۂ قاہرہ سے اشیار کو خواص سے اور مسببات کو اسباب سے اور مقدمات کو نتائج سے وابستہ کیا، وہی جوڑنے والا اور توڑنے والا ہے، مٹانے والا اور بنانے والا ہے، اور وہی تمام چیزوں کو عدم سے وجود میں لاتا اور لباسِ ہستی پہناتا ہے۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝	جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اسکا معمول تو یہ ہے کہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے

---

[1] سورہ یٰسین ـ ۸۲

اس کے سامنے یہ حقیقت اچھی طرح آگئی کہ اس کائنات میں کچھ اور عوامل و محرکات ہیں، جو افراد و اقوام کی تقدیر پر اس سے کہیں زیادہ اثر انداز ہیں جتنے کہ یہ طبعی اور ظاہری اسباب، اسی طرح ان سے جو نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ ان طبعی اور مادی نتائج سے بہت زیادہ انقلاب انگیز ہوتے ہیں، جو اسباب سے وابستہ و مربوط ہیں۔

یہ عوامل و محرکات ایمان و عمل صالح، اخلاق عالیہ، خدا کی اطاعت و عبادت، عدل و انصاف، رحم و محبت اور اسی طرح کے دوسرے معنوی اسباب ہیں، جو کفر و بغاوت، فساد فی الارض، ظلم و نفس پرستی اور گناہوں و معصیتوں جیسے معنوی اسباب کے بالکل برعکس کام کرتے ہیں۔

اسباب طبعی کو ترک کئے بغیر اگر کوئی ان صالح معنوی اسباب کو اختیار کریگا تو یہ کائنات اس سے مصالحت کرنے پر مجبور ہوگی، اور زندگی اپنی حقیقی لذت و حلاوت کے ساتھ اس کا ساتھ دیگی، اللہ تعالیٰ اس کے ہر کام میں سہولتیں اور آسانیاں پیدا فرمائے گا، اور بعض موقعوں پر اسباب طبعی بھی اس کے پابند کر دیئے جائیں گے، اور خارق عادت چیزیں ظاہر ہونے لگیں گی، اس کے برعکس جو دوسرے قسم کے غیر صالح اسباب سے اپنا تعلق رکھے گا اور صرف طبعی قوتوں پر اعتماد کریگا اور اپنی پوری زندگی اسی بنیاد پر قائم کرے گا تو یہ کائنات اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائے گی، جو طاقتیں اس نے اپنے تابع کر لی ہیں، وہ بھی اس کو دھوکہ دینے لگیں گی، وہ ہر لمحہ ان کی احتیاج میں رہے گا، اور یہ احتیاج برابر بڑھتی جائے گی، قدرت اس کے خلاف ہوگی، اور طبعی قوتیں اس کی راہ میں مزاحم ہونگی،

سورۂ کہف ایمان اور مادیت کی کشمکش کی کہانی ہے!

سورۂ کہف دو نظریات، دو عقیدوں اور دو قسم کی نفسیات کی کشمکش کی کہانی ہے، ایک مادیت اور مادی چیزوں پر عقیدہ، دوسرے ایمان بالغیب اور ایمان باللہ اس میں ان عقائد، اعمال و اخلاق اور نتائج و آثار کی تشریح کی گئی ہے، جو ان دونوں قسم کی نفسیات یا نظریات کے نتیجہ میں ظاہر ہوتے ہیں، اور اس اول الذکر نظریہ کو اختیار کرنے کے خلاف آگاہی دی گئی ہے، جو صرف مادہ اور اس کے مظاہر پر یقین رکھتا ہے، اور خدا اور غیبی قوتوں کا منکر ہے۔

اصحاب کہف کا قصّہ

اب ان چاروں قصوں کی طرف آئیے، سب سے پہلے جو قصہ ہمارے سامنے آتا ہے، وہ اصحاب الکہف والرقیم کا قصہ ہے، یہ اصحابِ کہف کون تھے، انسانی تاریخ میں اس قصہ کی کیا قیمت و افادیت ہے اور قرآن مجید نے اس خصوصیت و اہتمام کے ساتھ اس کا ذکر کیوں کیا ہے کہ وہ ایک زندہ جاوید کہانی بن گیا، اور اس کو تاریخ کے ہر دور میں برابر سنا اور سنایا جاتا رہا؟

مسیحی لٹریچر اور مذہبی کہانیوں میں اصحاب کہف کا تذکرہ

قبل اس کے کہ ہم اس قصہ کو قرآن مجید کے مخصوص معجزانہ اسلوب با مقصد

باوقار اندازِ کلام اور اس بلاغتِ قرآنی کے آئینہ میں دیکھیں جو غیر ضروری باتوں اور فضول بحثوں سے پاک اور بالاتر ہے، ہم پہلے قدیم مذہبی صحیفوں اور ان روایتی داستانوں میں اس کا سراغ لگاتے ہیں، جو سینہ بسینہ چلی آرہی ہیں، اور جس کو ایک نسل دوسری نسل تک منتقل کرتی آئی ہے، اس کے بعد ہم اس کا جائزہ لیں گے کہ اس داستان اور قرآن مجید کے بیان کردہ واقعہ میں کہاں کہاں اشتراک ہے اور کس جگہ اختلاف!

اصحابِ کہف کا ذکر عہد عتیق کے صحیفوں میں نہیں ہے اس لئے کہ یہ واقعہ عیسائی تاریخ کے آغاز میں اس وقت پیش آیا جب توحید اور بت پرستی چھوڑنے کی دعوت مسیح علیہ السلام کے متبعین کے ذریعہ پھیل چکی تھی، اور عہد عتیق کے آخری صحیفے بھی مرتب ہو چکے تھے، اس قصہ میں قدرتی طور پر (خاص طور پر اس وجہ سے کہ اس میں حضرت مسیحؑ کے متبعین کی جوانمردی واستقامت پوری طرح عیاں ہے) کوئی ایسی چیز نہ تھی جو یہودیوں کو اس کے حفظ ونقل پر آمادہ کرتی، البتہ عیسائیوں کے لئے یہ بہت محبوب وپسندیدہ مذہبی قصوں میں تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ بہ نسبت اور قصوں کے اس میں زیادہ حیرت انگیز اور پرکشش واقعات بیان کئے گئے تھے، مزید یہ کہ اس واقعہ سے مسیح علیہ السلام کے ابتدائی ماننے والوں کی مضبوطی واستقامت ان کی قوتِ ایمانی، اور عقیدہ واصول کے لئے ان کی خودشکنی وقربانی، اور مسیحیت کی اولین صاف وپاکیزہ تعلیمات کی خاطر ان کی غیرت وحمیت کا بڑا ثبوت ملتا تھا، اور وہ آج بھی ایمان کی دبی ہوئی چنگاری کو دوبارہ فروزاں کرنے، سوئی ہوئی غیرتِ ایمانی کو بیدار کرنے مزاحمت اور مقابلہ کی طاقت پیدا کرنے اور جدوجہد

قربانی کے راستہ پر ڈالنے کی قوت وصلاحیت رکھتا ہے، یہ عناصر جو اس قصہ کی امتیازی خصوصیت ہیں طویل انسانی تاریخ میں اس کے بقاء دوام کے ضامن ہیں، اور اسی وجہ سے اس کو روئے زمین کے اتنے بڑے رقبہ اور علاقہ میں شہرت و قبولیت حاصل ہوئی، اور ایک عہد سے دوسرے عہد اور ایک نسل سے دوسری نسل تک اس کو برابر منتقل کیا جاتا رہا، اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ زمانۂ سابق کے عیسائیوں نے اس کو کس طرح سمجھا تھا، اور بعد کے آنے والوں کے لئے اس سلسلہ کی کیا معلومات بہم پہونچائی تھیں؟

اس سلسلہ میں اخلاق و مذاہب کے انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل حسب ذیل ہے[1]:۔

"سات سونے والوں (SEVEN SLEEPERS) کا قصہ مقدس ہستیوں کے ان قصوں میں ہے، جس میں عقل کی تسلی و آسودگی کا سب سے زیادہ سامان ہے، اور جو آفاق عالم میں سب سے زیادہ مشہور ہے، قصہ کے عناصر جو قدیم ترین کتابوں میں نظر آتے ہیں حسب ذیل ہیں:۔

---

[1] مشہور انگریزی مورخ اڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) نے اپنی مشہور کتاب DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE میں اس قصہ کا اپنے خاص اسلوب میں ذکر کیا ہے جس میں ادب و تاریخ اور تبصرہ و تشریح ہر چیز کی آمیزش ہے اور جس میں عیسائیت کے لئے اس کا کھلا ہوا تعصب اور اسلام پر غیر ضروری اور بے موقع چوٹیں خوب نمایاں ہیں، دیکھئے صفحہ ۲۴۱-۲۴۳ جلد دوم،

MODERN LIBRARY GIANT SERIES (U. S. A.)

شہنشاہ ڈیسیس (DECIUS) یونان کے قدیم شہر افیسس[1] (EPHESUS) میں جاکر بت پرستی کی رسم کی تجدید کرنا چاہتا ہے اور باشندگان شہر بالخصوص عیسائیوں کو بتوں پر قربانی پیش کرنے کا حکم دیتا ہے، اس کے نتیجہ میں عیسائی عیسائیت ترک کر دیتے ہیں، اور ایک تعداد اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہتی ہے اور حکومت کے مظالم برداشت کرتی ہے، اس موقع پر سات نوجوان

[1] اکثر مفسرین مثلاً بیضاوی، نیشاپوری آلوسی اور ابن کثیر نے یہی رائے ظاہر کی ہے کہ یہ شہر افیسس تھا، اکثر مورخین اور عیسائی جغرافیہ دانوں کا بھی یہی خیال ہے گبن (GIBBON) نے بھی اپنی کتاب "زوال روما" میں اسی سے اتفاق کیا ہے، (دیکھئے سات سونے والوں (SEVEN SLEEPERS) کا قصہ)

جہاں تک اس مقام کے جغرافیائی تعین کا تعلق ہے بستانی کے دائرۃ المعارف نے یہ لکھا ہے کہ یہ اناطولیہ کے بارہ ایونی شہروں میں سے ایک ہے، اس کا محل وقوع نہر قیسطرہ کے جنوبی سمت میں ہے، اور وہ ازمیر سے ساٹھ کیلومیٹر کی مسافت پر ہے، رومیوں نے اس کو مغربی ایشیا کی ریاست کا پایۂ تخت بنایا تھا اور وہ بہت بڑا بارونق تجارتی مرکز تھا لیکن اسکے فخر کے لئے سب سے بڑی چیز یونانی دیوی ڈیانا کا وہ عظیم معبد ہے جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے اور سب سے بڑا یونانی بت ہے، بلیکی (BLACKIE) نے اپنی کتاب A MANUAL OF BIBLE HISTORY میں لکھا ہے کہ افیسس کا شہر تاریخ قدیم میں اپنے فلسفہ اپنے باشندوں کی بے قیدی و بیحیائی میں مشہور اور بد اخلاقی اور فسق و فجور میں ضرب المثل تھا، اس کی بت پرستی میں مغربی و مشرقی دونوں قسم کی بت پرستی کی آمیزش

(بعض روایات میں ان کی تعداد آٹھ بتائی گئی ہے) جو محل شاہی میں مقیم تھے، بادشاہ کے سامنے آتے ہیں (ان کے ناموں میں اختلاف ہے) ان پر اس کا الزام ہے کہ وہ خفیہ طور پر عیسائیت قبول کر چکے ہیں، یہ نوجوان بتوں کے لئے قربانی سے انکار کرتے ہیں، بادشاہ ان کو اس موقع پر ایک مدت کی مہلت دیتا ہے کہ شاید وہ راہ راست پر آجائیں اور نصرانیت سے توبہ کر لیں، اس کے بعد وہ شہر سے چلا جاتا ہے،

اس مدت میں یہ نوجوان شہر چھوڑ دیتے ہیں، اور ایک قریب کے پہاڑ میں جاکر جس کا نام ANCHILUS ہے ایک غار میں چھپ جاتے ہیں، ان میں ایک جس کا اصلی نام DIOMEDES تھا، لیکن اپنے چھپانے کے لئے اس نے اس نام کو بدل کر IMBLICUS رکھ لیا تھا، پھٹے اور میلے کپڑوں میں شہر جاتا ہے، تاکہ حالات کا پتہ لگائے، اور اپنے ساتھ کھانا بھی لیتا آئے اس پر کچھ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ شاہ ڈسیس پھر شہر میں واپس آجاتا ہے، اور حکم جاری کرتا ہے کہ یہ نوجوان اس کی خدمت میں حاضر کئے جائیں، DIOMEDES اپنے ساتھیوں کو اس شاہی حکم سے آگاہ کرتا ہے، وہ کھانا کھاتے ہیں، اور بڑے فکر و قلق میں پڑ جاتے ہیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک طویل اور گہری نیند ان پر مسلط کر دیتا ہے، جب ان نوجوانوں کا پتہ نہیں لگتا تو ان کے والدین کو طلب کیا جاتا ہے، وہ اس فرار سے اپنی بے تعلقی ظاہر کرتے ہیں، اور اس سے انکار کرتے ہیں کہ ان کا اس سازش میں کوئی ہاتھ ہے وہ بادشاہ کو یہ بتاتے ہیں کہ وہ ANCHILUS کے پہاڑ میں چھپے ہوئے ہیں، بادشاہ حکم دیتا ہے کہ غار کا منہ ایک بڑے پتھر سے بند کر دیا جائے تاکہ وہ اس میں اپنی موت مر جائیں اور اسی غار میں دفن رہیں،

دو عیسائی جن میں ایک کا نام THEODORE اور دوسرے کا RUFINUS تھا۔ ان شہید نوجوانوں کا قصہ جستہ کی ایک تختی پر لکھ کر نیچے دبا دیتے ہیں، جس سے غار کا منہ بند کیا گیا تھا۔

تین سو سات سال کے بعد شاہ تھیوڈوسس (THEODOSIUS) ثانی کے عہد میں ایک بغاوت ہوتی ہے جس کی قیادت بعض عیسائی کرتے ہیں، ایک جماعت جس کے رہنما پادری تھیوڈر (THEODORE) ہیں حیات بعد الموت اور حشرِ اجساد کا انکار کرتے ہیں، عیسائی بادشاہ اس بات سے خوف زدہ اور فکرمند ہوتا ہے اس موقع پر اللہ تعالےٰ ایک رئیس (جس کا نام ADOLIUS ہے) کے دل میں ڈالتا ہے کہ وہ اپنی بکریوں کے گلہ کے لئے اس میدان میں ایک باڑھ تیار کرے جہاں یہ غار واقع تھا معمار اس کی تعمیر کے لئے اس پتھر کا بھی استعمال کرتے ہیں جس سے غار کا منہ بند تھا اس طرح یہ غار کھل جاتا ہے، اس وقت اللہ تعالےٰ ان نوجوانوں کو بیدار کر دیتا ہے، ان کے دل میں یہ خیال گزرتا ہے، کہ وہ شاید صرف ایک رات سوئے ہیں، وہ ایک دوسرے کو اس کی وصیت کرتے ہیں، کہ اگر ضرورت پڑے تو انھیں ڈیسیس (DECIUS) کے ہاتھوں شہادت قبول کر لینی چاہیئے، ان میں سے ایک DIOMEDES حسب معمول شہر جاتا ہے، اور شہر کے پھاٹک پر صلیب کا نشان دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے یہاں تک کہ مجبور ہو کر ایک راہ گیر سے پوچھتا ہے کہ یہ واقعی افیسس ہے؟ اپنے ساتھیوں کو اس انقلاب عظیم کی خبر دینے کے لئے وہ بیتاب ہو جاتا ہے، لیکن جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے کھانا خریدتا ہے، اور اس کے بدلہ میں

وہ سکے پیش کرتا ہے، جو اس کے پاس تھے، یہ وہ سکہ تھا جو ڈیسیس کے عہد میں رائج تھا، دکاندار سمجھتا ہے، کہ صاحبزادہ کو شاید کوئی خزانہ مل گیا ہے وہ اور بازار کے اور لوگ اس میں اپنا حصہ لگانا چاہتے ہیں، اور نوجوان کو ڈرانے دھمکاتے ہیں، اور وسط شہر میں کھینچتے ہوئے لے چلتے ہیں، ایک مجمع اس کے چاروں طرف لگ جاتا ہے، نوجوان چاروں طرف دیکھتا ہے کہ شاید کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر پڑ جائے، لیکن کوئی جاننے والا اس کو نظر نہیں آتا، حاکم اسقف اس سے حال پوچھتا ہے، تو وہ سارا ماجرا بیان کر دیتا ہے، اور ان کو اس کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ اس پہاڑ تک چلیں اور اس کے دوسرے ساتھیوں سے ملاقات کریں، یہ لوگ اس کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر جاتے ہیں، وہاں ان کو سیسے کی دو تختیاں ملتی ہیں، جن سے نوجوان کے بیان کردہ واقعہ کی تصدیق ہو جاتی ہے، وہ غار میں داخل ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں، کہ اس کے ساتھی بھی زندہ ہیں، اور نور اور سکینت ان کے چہروں سے ظاہر ہے، یہ خبر بادشاہ THEODOSIUS تک پہونچتی ہے وہ بھی غار کی زیارت کے لئے آتا ہے اس موقع پر MAXIMILAN یا ACHILLIDES یا کوئی اور نوجوان کہتا ہے، کہ اللہ سبحانہ وتعالےٰ نے ان پر یہ نیند اسلئے مسلط کردی اور قیامت سے پہلے انکو بیدار اسلئے کر دیا تاکہ حشر ونشر کا ثبوت ملجائے، اسکے بعد یہ نوجوان اپنی طبعی موت مرے اور ایک رومی معبد ان کی یادگار کے طور پر وہاں قائم کر دیا گیا[1]،

---

[1] ARTICLE "SEVEN SLEEPERS" ENCYCLOPAEDIA OF RELIGIONS AND ETHICS

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

جہاں تک اس قصہ کی تاریخی اہمیت کا تعلق ہے بڑے بڑے مورخ اور قصے کہانیاں اور تاریخی داستانوں اور روایتوں کے ناقد بھی اس کی صحت کے قائل ہیں اور اس کو بعید از امکان نہیں سمجھتے، اور اس کی وجہ وہ شہرت اور تواتر اور نسل درنسل اس کی منتقلی اور ان تمام قدیم کتابوں میں اس کا ذکر ہے، جن سے مسیحی دنیا بھری ہوئی ہے، گبن جس کا رجحان ہمیشہ اس قسم کے محیر العقول واقعات، اور قصے کہانیوں کی تردید وانکار کی طرف رہتا ہے، اس واقعہ کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اس عجیب وغریب قصہ کو محض یونانی روایات وخرافات اور انکے مذہبی مغالطوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ اس (مفروضہ) معجزہ کے پچاس سال تک اس کی مستند وقابل اعتماد روایات کا پورا تسلسل قائم رہا، ایک شامی پادری نے جو تھیوڈیسیس اصغر کے دو سال بعد پیدا ہوا تھا، اور جس کا نام JAMES OF SARUS تھا، اس کی ایک کہانی کو (جو دو سو تیس کہانیوں میں ایک تھی) انیسس کے ان نوجوان (اصحاب کہف) کی مدح کے لئے مخصوص کر دیا تھا، اور

(باقی صفحہ ۲۶ کا) اس قصہ کو ابن جریر طبری اور دوسرے مفسرین اور علماء اسلام نے تفصیل کے ساتھ محمد بن اسحاق کی روایت سے درج کیا ہے لیکن مسیحی مآخذ کی عدم موجودگی یا عدم اشاعت اور قبل نصرانیت کی رومی تاریخ سے مکمل واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اس میں بہت سے اوہام راہ پا گئے ہیں (نمونہ کے لئے دیکھئے تفسیر ابن کثیر ج ۱۵ صـ ۱۲۳ تا صـ ۱۲۶) اس لئے ہم نے یہاں اس کے بجائے اصل مسیحی مآخذ کو ترجیح دی ہے،

قبل اس کے کہ چھٹی صدی مسیحی کا اختتام ہو، اصحابِ کہف کا یہ قصہ شامی زبان سے لاطینی میں GREGORY OF TOURS کی نگرانی میں منتقل کر دیا گیا، مسیحی مشرق میں عشاءِ ربانی کے اجتماعات کے موقع پر اصحابِ کہف کی یاد بڑے احترام وعظمت کے ساتھ منائی جاتی رہی، ان کے نام رومی تہواروں اور روسی تقویم میں غایت درجہ احترام کے ساتھ مندرج تھے اور ان کی شہرت صرف عیسائی دنیا تک محدود نہ تھی[۱]"

جہاں تک ان سالوں کا تعلق ہے جو انھوں نے اس غار میں گزارے ان کی تعداد تین سو سال (جیسا کہ مفسرین اسلام نے مسیحیوں سے نقل کیا ہے) اور تین سو سات سال کے درمیان ہے، موخر الذکر قول (انسائیکلوپیڈیا مذاہب و اخلاق) کے مقالہ نگار کا ہے، تین سو سال اور تین سو نو سال (جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے) کے درمیان اس فرق کو متقدمین مفسرین اسلام نے شمسی وقمری تقویم کے اختلاف پر محمول کیا ہے۔

ابن کثیر کا بیان ہے کہ "یہ اللہ تعالےٰ کی خبر ہے جو اس نے اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو اصحابِ کہف کے غار میں مدت قیام کی بابت دی ہے، جب سے ان پر نیند مسلط کی گئی، یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے ان کو بیدار کیا، اور اہل زمانہ کو ان کے حال سے آگاہ کیا، اس کی مقدار تین سو سال تھی جو قمری حساب سے

---

[۱] دیکھئے کتاب "زوال روما" مولفہ گبن جلد دوم (سات سونے والے) ص ۲۴۳ ص ۲۴۴

MODERN LIBRARY GIANT SERIES (U. S. A.)

نو سال زیادہ بڑھتی ہے، اور شمسی حساب سے تین سو سال ہوتی ہے اس لئے کہ ہر سو سال میں قمری و شمسی تقویم میں تین برس کا فرق واقع ہو جاتا ہے، اسی لئے ثلاث مائۃ کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا، "وازدادوا تسعا"[1] (اور زیادہ کئے اس میں نو)"

انسائیکلوپیڈیا کا جو اقتباس اوپر گزرا ہے، اس میں اور گبن کی کتاب میں نیز تفسیر و تاریخ کی اکثر کتابوں میں عام طور پر یہی بات لکھی گئی ہے کہ اصحاب کہف کا غار میں پناہ لینے کا واقعہ رومی بادشاہ ڈیسیس کے عہد میں پیش آیا جس کو عرب مورخین اور علماء اسلام عام طور پر دقیانوس کہتے ہیں، یہ بادشاہ اپنی سخت گیری اور اپنے تعصب و مظالم میں بہت مشہور تھا، دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اصحاب کہف کے ظہور کا واقعہ صاحب ایمان عیسائی بادشاہ تھیوڈوسیس دوم کے زمانہ میں پیش آیا، یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں بادشاہوں کا درمیانی وقفہ زیادہ سے زیادہ دو سو سال ہے، اسی بنیاد پر گبن نے اس مدت کا مذاق اڑایا ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، بعض قدیم و جدید مفسرین[2] نے اس اشکال سے بچنے کے لئے یہ رائے ظاہر کی کہ قرآن میں جو یہ آیا ہے (ولبثوا فی کہفہم ثلاث مائۃ سنین وازدادوا تسعا) وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں ہے بلکہ یہ بات اہل کتاب کی طرف منسوب کر کے کہی گئی ہے اور اس کا تعلق صرف ان کے قیاسات و اندازوں سے ہے، اور یہ بات علیحدہ اور مستقل بالذات نہیں بلکہ اس کا جوڑ ان

---

[1] تفسیر ابن کثیر (سورہ کہف)

[2] مثلاً علامہ جمال الدین قاسمی مولف تفسیر قاسمی، اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔

ماسبق آیات سے ہے، جن میں یہ کہا گیا، (سیقولون ثلاثۃ رابعھم کلبھم)۔۔۔۔ (کہیں گے۔ یعنی اہل کتاب تین ہیں چوتھا ان کا کتا ہے) اس قول کو قتادہ اور مطرف بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے اور اس میں یہ قرأت شاذہ بھی مروی ہے (وقالوا ولبثوا فی کھفھم ثلاث مائۃ سنین وازدادوا تسعا) اس قول کو ترجیح دینے والوں نے اللہ تعالےٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے، جو اس کے معًا بعد آیا ہے یعنی (قل اللہ اعلم بما لبثوا لہ غیب السمٰوٰت والارض) وہ کہتے ہیں، کہ اگر مدت کا تعین اللہ تعالےٰ کی طرف سے تھا، تو آگے کی آیت میں اس کو علم الٰہی کے حوالہ کرنے کی ضرورت نہ تھی، یہی تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے لیکن علامہ آلوسی نے لکھا ہے، کہ یہ بات حبر[1] رضی اللہ عنہ سے اس لئے درست نہیں کہ اصحاب کہف کی تعداد انھوں نے سات ہی لکھی ہے حالانکہ اسکے بعد بھی یہ آیت ہے کہ "قل ربی اعلم بعدتھم"[2] (کہو اللہ تعالےٰ ان کی تعداد کو زیادہ بہتر جانتا ہے) اس لئے کہ "قل اللہ اعلم بما لبثوا" اور اس آخر الذکر آیت میں معنیٰ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں اور دونوں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے، پس وہ اس موقع پر اس کا حوالہ کیوں کر دے سکتے ہیں، جب کہ پہلے مسئلہ میں انھوں نے خود اس کو اختیار نہیں کیا[3]۔

بعض اور ممتاز علماء نے بھی اس نظریہ کی تردید کی ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ عربی زبان کا ذوق سلیم اس سے انکار کرتا ہے اور اگر آدمی کو پہلے سے اس تاویل

---

[1] حبر ہذہ الامۃ مراد ہے، جو حضرت ابن عباسؓ کا لقب تھا، [2] سورہ کہف ۲۲

[3] روح المعانی (تفسیر سورۂ کہف)

یا اس تفصیل کا علم نہ ہو تو اس کا ذہن خود سے اس بات کی طرف منتقل نہیں ہوتا،
امام رازی لکھتے ہیں :-

"اللہ تعالیٰ کا قول" سیقولون ثلاثۃ رابعھم کلبھم" پہلے
گزرا ہے، اس کے اور اس آیت کے درمیان جو آیت ہے، اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں، "فلا تمار فیھم
الا مراء ظاھرا" (پس نہ جھگڑا کرو اس میں مگر ظاہری طور پر) اس
آیت "قل اللہ اعلم بما لبثوا لہ غیب السماوات والارض"
سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے پہلے کوئی حکایت ہو، اس لئے کہ اس سے
اللہ تعالیٰ کی مراد یہ صرف ہے کہ اہلِ کتاب جو یہ کہتے ہیں، اس کو چھوڑ کر
اللہ کی دی ہوئی خبر پر اعتماد کرو [1]"

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ (اللہ اعلم بما لبثوا) کی بنیاد پر
بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اہل کتاب کا قول ہے حالانکہ یہ بات درست نہیں،
اللہ تعالیٰ نے یہ بات اہلِ کتاب کی طرف منسوب نہیں کی، بلکہ یہ خود اللہ تبارک و
تعالیٰ ہی کا کلام ہے [2]۔

ہمیں اپنے ذہن میں یہ بات پھر تازہ کر لینی چاہیئے کہ اس اشکال اور
فرض کردہ تضاد و اختلاف (جو ہمیں قرآن مجید کی بیان کردہ مدت اور گنتی کی
اس تعداد کے درمیان نظر آتا ہے، جو رومی تاریخ کے جائزہ کی روشنی میں لکھی گئی ہے)
کی بنیاد یہ شہرت ہے کہ ان نوجوانوں کی یہ روپوشی اور غار میں پناہ لینے کا واقعہ

---

[1] تفسیر کبیر (سورہ کہف) جلد سوم [2] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح

"ڈیسیس کے عہد میں پیش آیا جس کی مدت حکمرانی ستمبر ۲۴۹ء سے لے کر جون ۲۵۱ء تک ہے، شاید جس چیز نے اس کو اس قصہ کا ہیرو بنادیا وہ اس کی قساوت و خوں ریزی، عیسائیوں پر عمومی مظالم اور سرکاری حکام کے سامنے بتوں کیلئے قربانی اور ذبیحوں پر اصرار اور ان سے سند اعتراف لینے کا حکم ہے[1]، لیکن جو چیز اس واقعہ میں شبہ پیدا کر رہی ہے، وہ یہ ہے کہ اس بادشاہ کی حکومت کا زمانہ بہت مختصر تھا، اس کو دو سال بھی آزادانہ حکمرانی کا موقع نہ مل سکا اور یہ مدت بھی زیادہ تر قوم گوتھ (GOTHS) کے ساتھ مسلسل جنگوں میں گزری اور وہ فرانس میں دریائے رائن (RHINE) کے کنارے انھیں کے ہاتھوں مقتول ہوا، اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس کو اس قلیل مدت میں اس عظیم و وسیع سلطنت کے تابع دوسرے مشرقی یونانی شہروں کا دورہ کا موقع ملا ہو، تاریخ میں یونان اور مشرقی سلطنت میں اس کے سفر کا سراغ بہرحال نہیں ملتا، THE HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD میں ہے کہ ڈیسیس کا عہد بہت مختصر اور پرسکون تھا، زمام حکومت سنبھالتے ہی اس کو ایک بغاوت کی سرکوبی کے لئے "گال" کی طرف

---

[1] دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مقالہ ڈیسیس (DECIUS) ج ۷، ص ۱۵۰ ایڈیشن ۱۹۶۳ء، ارمن تاریخ سے ہر واقف شخص یہ جانتا ہے کہ اس فرمان اور سند اعتراف کا موجد یا محرک ڈیسیس نہیں، بلکہ اس سے بہت عرصہ پہلے "تراجان" نے اس کا اجرا کیا تھا اور اسی کے عہد میں بیت المقدس اور حلب کے بڑے پادریوں کو عیسائیت کے جرم میں سزائے موت دیدی گئی تھی دیکھئے۔ HISTORY OF THE CHRISTIAN CHURCH BY GEORGE H. DRYER P. 65 & 66.

رخ کرنا پڑا، اس کا کل زمانۂ حکمرانی گوتھ (GOTHS) کے ساتھ جنگ میں گزرا[۱]
مورخین نے ان عیسائی رہنماؤں کے نام بھی درج کئے ہیں، جن کو بادشاہ نے فرمان شاہی سے سرتابی کے جرم میں سزائیں دیں، اس میں اصحاب کہف کا کہیں ذکر نہیں ہے، ان سزا یافتہ عیسائیوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہ تھی، "گبن" نے لکھا ہے، کہ "سزا پانے والے مظلوموں کی تعداد دس مردوں اور سات عورتوں سے زیادہ نہ تھی[۲]"

دوسری بات یہ ہے، کہ چند عیسائیوں کی روپوشی ایک مقامی قسم کا واقعہ تھا، اور اس وقت اس کو اتنی اہمیت حاصل نہ تھی کہ مورخ اس کی طرف توجہ کرتے اور مصنف اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کرتے، اس کے برخلاف اس طویل اور خارق عادت نیند کے بعد ان کی بیداری، پھر ان کی شہر میں آمد، مذہبی حلقوں میں اس کی صدائے بازگشت، اور آفاق عالم میں اس کی شہرت ایک بالکل غیر معمولی اور عجیب وغریب واقعہ تھا، چنانچہ یہ دوسرا واقعہ یعنی ان کی بیداری اور تھیوڈ لیسیس کے زمانہ میں عیسائی دنیا میں اس خبر کی شہرت و تواتر اس قسم کے واقعات میں سے تھا جو ہر شخص کی زبان پر ہوتے ہیں، اور کوئی مجلس و محفل ان کے تذکرہ سے خالی نہیں ہوتی، اور جن کی گونج دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچتی ہے، مورخ بھی اس کو قلمبند کرنے کے شائق نظر آتے ہیں، اور راوی و ناقل بھی اس کی نقل و حکایت میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتے ہیں، اس بنیاد پر یہ بات زیادہ قرین قیاس

---

[۱] ایضاً (VOL. VI-PAGE 413)

[۲] تاریخ زوال روما مولفہ گبن جلد دوم ص ۹

ہے، کہ ان پر ظلم و زبردستی اور اس کے بعد ان کی روپوشی کا واقعہ شاہ ہیڈرین[۱] HADRIAN PUBLIUS (AELIUS HADRINUS) کے زمانہ میں پیش آیا ہو جس نے

---

[۱] ہیڈرین نے ۱۱۷ء سے ۱۳۸ء تک حکومت کی وہ "تراجان" کے بعد تخت حکومت پر بیٹھا اور کونسل نے اگست ۱۱۷ء میں اس کی توثیق کی، اس نے اس کی بہت کوشش کی کہ یونانی شہروں کی وہ پرانی رونق اور آب و تاب پھر واپس آجائے، اس نے رومی سرحدوں کی حفاظت کے لئے ایک شہر پناہ بھی قائم کی، ۱۳۲ء میں یہودیوں کی جو بغاوت ہوئی اسکی سرکوبی بھی اسی بادشاہ نے کی، اور اس پر قابو پانے کے لئے بہت بے رحمی اور سنگدلی سے کام لیا گیا، اس نے سب یہودیوں کو جلاوطن کرنے کا حکم دیا، اور بیت المقدس کی زیارت کے لئے سال میں صرف ایک مرتبہ آنیکی اجازت دی گئی، اس کے بعد یہودیوں کی جلاوطنی اور اخراج کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ قائم ہو گیا HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD اس نے ۱۲۹ء میں ایشیائے کوچک اور شام کا سرکاری دورہ کیا اور سمرنا میں ایک دربار کیا جس میں مشرقی ممالک کے تمام سلاطین و امراء کو مدعو کیا گیا، سردی کا زمانہ اس نے حلب میں گزارا اور ۱۳۰ء میں جنوب کی طرف رخ کیا۔ قدس کے کھنڈر پر نیا شہر بسانے کا حکم دیا اور عرب ممالک سے ہوتے ہوئے مصر پہونچا، ۱۳۲ء میں فلسطین واپسی پر مجبور ہوا جہاں اس کو یہودیوں کی ایک بغاوت کو ختم کرنا تھا، اسکے بعد علم قیادت اس نے مشہور قائد جولیس سیورس JULIUS SEVERUS کے حوالہ کیا اور رومہ واپس آیا مقام BAIAE میں ۱۰ جون ۱۳۸ء میں اس کا انتقال ہوا، ہیڈرین کی زندگی متضاد چیزوں کا مجموعہ ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۱۱) عیسائی کلیسا کی تاریخ میں جس کا مصنف GEORGE H. DRYER ہے، اس کے متعلق یہ الفاظ ملتے ہیں:۔

"ہیڈرین اگرچہ قدیم رومیوں سے مختلف تھا تاہم وہ بڑا ترقی پسند اور (باقی صفحہ ۳۵ پر)

ایک طویل عرصہ تک حکمرانی کی، اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشرقی ریاستوں کا بہت دن تک (جس کی مدت ۲۹ئہ سے لے کر ۳۴ئہ تک پھیلی ہوئی ہے) دورہ کرتا رہا، یہ بالکل ضروری نہیں کہ یہ ظلم اور مذہبی تشدد براہ راست اسی کے ذریعہ یا اسی کے مشورہ سے ہوا ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ اس میں اس کے علم و رضامندی کو بھی دخل ہو، رومی سلطنت اس کے عہد میں بہت وسیع ہو چکی تھی، اور حکام اور اہل کارانِ حکومت بڑی تعداد میں مختلف ریاستوں اور شہروں میں موجود تھے، چنانچہ اس بات کا پورا احتمال ہے کہ ان میں سے کوئی حاکم اور اپنے علاقہ کا ذمہ دار مذہبی بنیاد پر ظلم و تشدد پر اتر آیا ہو اور اس نے اپنے ذاتی جذبہ اور مذہبی جوش سے یا حکومت کی عام سیاسی پالیسی پر عمل درآمد کی خاطر اس نئے مذہب کے خلاف سخت گیر طریقہ اپنا لیا ہو، یہ بات کوئی مفروضہ نہیں بلکہ ہر حکومت اور ہر عہد میں پیش آتی رہی ہے، اس لئے اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ان کی روپوشی کا واقعہ بادشاہ ہیڈرین کے اسی دورہ میں پیش آیا، اور ان کی بیداری اور ظہور کا واقعہ تھیوڈوسیس کے عہد میں ہوا تو قرآن کے بیان اور عیسائیوں کی بیان کردہ مدت میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہتا، اور وہ بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے جس کی

(باقی صفحہ ۳۴ کا) مذہبی معاملات میں بہت خوردہ گیر تھا، اور ان کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتا تھا اگرچہ اس نے زندقہ کا الزام لگانے اور اجتماعی بہتان تراشی سے بچنے کا اشارہ دیا تھا، لیکن وہ زندیقوں اور ملحدوں کو (جو زیادہ تر عیسائی ہوتے تھے) بتوں اور معبودوں کے سامنے قربانی پیش کرنے اور مشرکانہ رومی مذہب سے وابستگی پر مجبور کرنے میں اپنے پیشرو تراجن ہی کی پالیسی پر کاربند رہا (ص۶۶)

وجہ سے گبن کو استہزاء کا موقع ملا تھا، ایسا کرنا اس لئے بھی ممکن اور قابل قبول ہے کہ اس قصہ کے آغاز اور انجام دونوں کا زمانی تعین اور تیقن پوری طرح واضح نہیں، خود شامی اور یونانی مورخین کے اقوال میں (جو ان کی بیداری کے سال کے بارے میں ہیں) بڑا اضطراب پایا جاتا ہے، شامی مورخین کا دعویٰ ہے کہ یہ ۴۲۵ء یا ۴۲۶ء کی بات ہے، یونانی روایات کا کہنا یہ ہے کہ ان کا خروج تھیوڈوسیس ثانی[1] کی حکومت کے ۳۸ ویں سال پیش آیا اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ ۴۴۶ء کا واقعہ ہے[2]۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید جو آسمانی کتابوں کا محافظ و نگراں بھی ہے، ان مضطرب اور مختلف روایات اور تاریخی کہانیوں سے زیادہ قابل اعتماد ہے جو کمی و بیشی، حذف و تغیر اور ترمیم و اضافہ کا ہمیشہ سے شکار رہیں، عیسائیت کے خلاف تشدد اور مظالم کی لہر نیروں (۶۴ء) کے زمانہ میں زیادہ کھلے ہوئے اور تند و تیز طریقہ پر سامنے آئی اور اس کی تباہ کاریوں کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ رومیوں نے بالآخر اس کو عمومی طریقہ پر ختم کر دینے کی کوشش کی قسطنطین نے چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیت قبول کر لی، اس لحاظ سے مسیحیت کی ابتدائی تاریخ اب تک اشتباہ اور بے یقینی کے پردوں میں ہے، غرابت و ضعف روایت کی وجہ سے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اور اس میں تاریخی تدوین و ترتیب کی بھی بڑی کمی ہے، جو اعتماد و یقین کے حصول کے لئے ضروری ہے۔

ایک چھوٹی سی جماعت کا ایک چھوٹے سے شہر میں روپوشی اور پناہ گیری کا

---

[1] دیکھئے گبن کی تاریخ [2] تھیوڈوسیس کی مدت حکومت ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک ہے،

واقعہ (جو پورے ملک کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے) ان کے اس ظہور یا دریافت کے واقعہ سے بہت مختلف ہے جس میں حیرت و استعجاب اور ندرت کے تمام عناصر جمع ہو گئے تھے، اور جو اس بادشاہ کے عہد میں پیش آیا جو خود ان کا ہم مذہب تھا۔

اس واقعہ کی اصل اہمیت اور اثرات کا اندازہ اس ماحول ہی میں ہو سکتا ہے، جس میں حشر و نشر، اور حیات بعد الموت کا عقیدہ سخت اختلاف اور بحث و مباحثہ کا موضوع تھا، اور ایک ایسی روشن دلیل کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی، جو اس کے امکان و وقوع کا یقین پیدا کر سکے، اس قصہ کا انجام و اختتام اور اس عہد کا تعین جس میں اصحاب کہف اپنی نیند سے بیدار ہوئے اور ان کا آوازہ سارے ملک میں پھیل گیا، ایسا واقعہ ہے جس میں شک و شبہ اور تذبذب کی کوئی گنجائش نہ ہونی چاہیئے، اسلئے کہ انسانی فطرت اہم اور حیرت انگیز واقعات کی طرف ہمیشہ زیادہ متوجہ ہوتی ہے اور وہ اسکے دماغ کے حفاظت خانہ میں اچھی طرح محفوظ ہو جاتے ہیں، علاوہ بریں مختلف دینی، جذباتی، اور عقلی محرکات کا بھی یہ تقاضہ تھا کہ اس کو تاریخ میں امانت داری کے ساتھ محفوظ کر کے آئندہ نسلوں تک پہونچا دیا جائے، برخلاف قصہ کے آغاز کے جس میں اس وقت کوئی خاص کشش نہ تھی، اور نہ یہ دواعی و محرکات موجود تھے، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

قرآن مجید نے اس قصہ کا انتخاب کیوں کیا؟

مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں اس عجیب و غریب قصہ کے ذکر کا

اصل سبب محمد بن اسحاق کی وہ روایت ہے[1] جس میں علماء یہود کے پاس قریش

[1] ابن جریر بیان کرتے ہیں۔

"روایت کی ہم سے ابوکریب نے کہ روایت کی ہم سے یونس بن بکر نے ان سے روایت کی محمد بن اسحاق نے، وہ کہتے ہیں کہ اہل مصر میں سے ایک شیخ نے جو کچھ اوپر سن چالیس میں آئے تھے، عکرمہ سے انھوں نے ابن عباس سے روایت مجھے سنائی کہ قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ ابن ابی معیط کو مدینہ میں علماء یہود کے پاس بھیجا اور ان سے کہا کہ وہ ان سے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے متعلق دریافت کریں، اور ان کے اوصاف و اقوال ان کے سامنے رکھیں، اس لئے کہ یہ لوگ سب سے قدیم اہل کتاب میں سے ہیں، اور انبیاء کا جتنا علم ان کے پاس ہے ہمارے پاس نہیں ہے، یہ دونوں چلے جب مدینہ پہونچے تو ان علماء سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق دریافت کیا، آپ کے بعض اوصاف واقوال سے ان کو آگاہ کیا اور یہ کہا کہ آپ لوگ توریت کے عالم ہیں، ہم آپ کے پاس اس غرض سے آئے ہیں کہ آپ ہمارے ان صاحب کے سلسلہ میں کچھ خبر دیں، ان یہودی عالموں نے کہا کہ تم ان سے یہ تین باتیں پوچھنا جو میں تم کو بتاتا ہوں اگر وہ واقعی خدا کے بھیجے ہوئے نبی ہیں، تو وہ اس کا صحیح صحیح جواب دے دیں گے، اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو سمجھ لینا کہ کوئی باتیں بنانے والا ہے اس کے بعد جو سمجھ میں آئے کرنا، ان سے ان نوجوانوں کے بارہ میں پوچھنا جو قدیم زمانہ میں غائب ہو گئے تھے اس لئے کہ ان کی داستان بہت عجیب و غریب ہے، اس جہاں گرد و سیاح شخص کے متعلق پوچھنا جو مشرق و مغرب دونوں جگہ پہونچ گیا تھا، اس کا قصہ کیا ہے، اور روح کے متعلق پوچھنا کہ اس کی حقیقت کیا ہے، اگر وہ ان باتوں کا جواب دیدیں اور سب واقعہ بیان کر دیں تو ان کی بات (باقی صفحہ ۴۹ پر)

کے ایک وفد کی آمد کا ذکر ہے، جو ان سے کچھ ایسے سوالات معلوم کرنا چاہتا تھا،

(باقی صفحہ ۳۸ کا) مان لینا، اور اگر نہ بتا پائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یوں ہی یہ سب باتیں گڑھتے رہتے ہیں، یہ دونوں مکہ لوٹ کر آئے اور قریش کے پاس پہونچ کر کہا کہ ہم لوگ آپ کے اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی بابت بہت فیصلہ کن چیز لے کر آئے ہیں، علماء یہود نے ہم کو یہ باتیں بتائی ہیں، اس کے بعد انھوں نے ان سب باتوں کا ذکر کیا، وہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے اے محمدؐ ہمیں ان باتوں کی خبر دیجئے، پھر انھوں نے وہ سب سوالات کئے، جو انھوں نے بتائے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کل ان باتوں کا جواب دوں گا، آپ نے کوئی استثنا اس میں نہیں کیا، وہ لوگ واپس ہو گئے اسکے بعد ۱۵ روز آپ پر اس طرح گزرے کہ نہ کوئی وحی نازل ہوتی تھی نہ جبرئیل علیہ السلام آتے تھے، یہاں تک کہ اہل مکہ کو خوب کہنے سننے کا موقع مل گیا، انھوں نے کہنا شروع کیا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے کل کا وعدہ کیا تھا، اور آج پندرہ دن ہو چکے ہیں، اور ابھی تک اللہ تعالےٰ نے ان کو وحی نہیں بھیجی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بہت شاق گزری اور ان کی باتوں سے آپ کو تکلیف پہونچی پھر جبرئیل علیہ السلام سورۂ کہف لے کر آئے جس میں آپ کے رنج پر عتاب بھی تھا، اور ان نوجوانوں کا قصہ بھی بیان کیا گیا تھا، اور سیاح شخص کا تذکرہ بھی تھا، اور ان کا یہ قول بھی (ویسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا) واضح رہے کہ اس روایت میں ایک راوی مجہول ہے جس سے محمد بن اسحاق روایت کرتے ہیں اور فن حدیث کے لحاظ سے یہ روایت زیادہ اعتماد کے قابل نہیں ۔

جن سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا امتحان لیا جا سکے، چنانچہ علماء یہود نے قریش کے وفد کو چند سوالات لکھ کر دیئے جن میں ایک سوال اصحاب کہف کے سلسلہ میں بھی تھا۔

یہ روایت اگر صحیح بھی ہو تب بھی وہ اس واقعہ کے ذکر کا بنیادی یا واحد سبب قرار نہیں دی جا سکتی جس واقعہ کا انتخاب ان بکثرت واقعات میں سے کیا گیا ہے، جن میں مذہبی بنیاد پر اس سے زیادہ ظلم کی مثالیں ملتی ہیں اور جن کے علم کا ذریعہ وحی آسمانی کے سوا اور کوئی نہ تھا، درحقیقت نزول آیات کے واقعات واسباب (جن میں مفسرین نے بڑی تفصیل کے ساتھ اور دل کھول کر کلام کیا ہے، اور جن سے علماء متقدمین نے ہمیشہ بڑی دلچسپی لی) اکثر اتنی اہمیت نہیں رکھتے ہیں، جتنی بہت سے علماء نے بیان کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اصلاح وتعلیم کے ان بڑے مقاصد میں جن کی تکمیل کے لئے قرآن مجید نازل ہوا، اس فاسد ماحول میں جس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اس فطرت انسانی میں جس میں کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا، ان زمانوں میں جو پیہم رواں دواں ہیں، اور اپنا لباس تبدیل کرتے رہتے ہیں، اور ان انسانی نسلوں میں جن سے قرآن مجید برابر مخاطب ہے، اور جن کی زمام قیادت اور منصب امامت نبوت محمدی کے ہاتھ میں ہے، اس سے زیادہ طاقتور محرکات ودواعی موجود ہیں، یہ اسباب کسی سوال اور چند لوگوں کے امتحان لینے کی خواہش یا بعض مفسرین کے بیان کردہ شان نزول سے زیادہ لائق اہتمام اور قابل توجہ ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی بیش قیمت کتاب "الفوز الکبیر" میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے

لکھا ہے کہ:۔

"عام مفسرین آیات مخاصمت یا آیات احکام میں سے ہر ایک آیت کو کسی نہ کسی واقعہ سے ضرور وابستہ کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ یہی واقعہ اور قصہ اس کے نزول کا محرک تھا، حالانکہ یہ بات ثابت اور طے شدہ ہے کہ نزولِ قرآن کا بنیادی مقصد انسانی نفوس کی تہذیب و آراستگی، عقائد باطلہ کا خاتمہ اور اعمال فاسدہ کا انسداد ہے چنانچہ کسی عاقل و بالغ گروہ میں عقائد باطلہ کا وجود بذات خود آیات و احکام کے نزول کا کافی و وافی سبب ہے، اسی طرح اعمال فاسدہ اور مظالم کا وجود آیاتِ احکام کے نزول کا محرک، اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں، نشانیوں اور عبرت انگیز واقعات کا ذکر آیا ہے، اس سے غفلت و بے پرواہی آیات تذکیر کا سبب ہے، جزئی واقعات اور بعض متعین قصوں میں جن کے منقولات و روایات میں مفسرین نے بڑی دراز نفسی اور دردسری سے کام لیا ہے، درحقیقت ان آیات میں اتنا دخل نہیں رکھتیں، سوائے ان بعض آیات کے جن میں خود کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں یا اس سے قبل پیش آیا چنانچہ سامع کا خلجان دور کرنے کے لئے جو اس اشارہ سے پیدا ہوتا ہے، اس موقع پر واقعہ کی تفصیل ضروری ہے[1]"

اصحابِ کہف کا یہ قصہ بہت مناسب وقت اور صحیح موقع و محل میں

---

[1] الفوز الکبیر

بیان کیا گیا ہے، اس لئے کہ مکہ کے مسلمان اس وقت اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے، جن کا سامنا قیصروں کے ظلم وتشدد اور استبداد کے نقطۂ عروج میں اصحابِ کہف کو کرنا پڑا، یہ وقفہ جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے، اس وقفہ سے بہت مشابہ تھا، جس وقفہ میں ترک وطن اور غار میں روپوشی سے پہلے یہ صاحبِ ایمان نوجوان تھے، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی اس بلیغ ومعجزانہ تصویر سے بڑھ کر کوئی تصویر نہیں ہوسکتی، جن میں مکہ کے مسلمانوں کا پورا نقشہ بیان کردیا گیا ہے:۔

وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ[1]	اور وہ وقت یاد کرو جب (مکہ میں) تمہاری تعداد بہت تھوڑی تھی، اور تم ملک میں کمزور سمجھے جاتے تھے، تم اس وقت ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں اُچک نہ لے جائیں۔

حدیث کے مجموعے اور سیرت کی کتابیں ظلم وسنگدلی اور سفاکی وبے رحمی کے ان واقعات سے پر ہیں، جو اہلِ ایمان کو پیش آرہے تھے، حضرت بلالؓ، عمارؓ، خبابؓ، مصعبؓ، سمیّہ رضی اللہ عنہم اور ان کے دوسرے احباب ورفقاء کے واقعات سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں، اور وجدان وطبعِ سلیم میں ظلم کی نفرت وکراہیت پیدا ہونے لگتی ہے، قرآن مجید اور سیرت نبوی میں اس گھٹی گھٹی فضا اور سہمے ہوئے ماحول کی پوری تصویر ہے، جس میں مکہ کے مسلمان زندگی گزار رہے تھے، اس بوجھل وکہر آلود فضا میں امید کی کوئی کرن

---

[1] سورہ انفال۔ ۲۶

نظر نہ آتی تھی، اور معاشرہ میں کوئی ایسا روزن باقی نہ تھا جس سے روشنی کی کوئی شعاع یا تازہ ہوا کا کوئی جھونکا اندر آسکتا، مسلمان دراصل چکی کے دو پاٹ کے درمیان آگئے تھے یا دوسرے الفاظ میں ایک بے رحم و خونخوار درندہ کے پنجوں یا جبڑوں میں موت وزیست کی لڑائی لڑ رہے تھے، قرآن مجید نے اپنے بلیغ طریقہ پر اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:۔

حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ[1]	جبکہ زمین اپنی ساری وسعت پر بھی ان کے لئے تنگ ہو گئی تھی اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آگئے تھے، اور انھوں نے جان لیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر انھیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی مگر خود اسی کے دامن میں،

عین اس وقت آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے، اور قرآن مجید ان اہلِ ایمان کے لئے ایک ایسا قصہ بیان کرتا ہے جس میں تنگی کے بعد کشائش، سختی کے بعد آسانی، ذلت کے بعد عزت، اور سات آسمانوں سے خارق عادت طریقہ پر نصرت الٰہی کے نزول کا ایک ایسا عجیب واقعہ پیش کیا گیا ہے، جو ہر قیاس اور تجربہ کو جھوٹا ثابت کرتا ہے، اور عقل و دانش کے تمام ظاہری پیمانوں کو چیلنج کرتا ہے، اور یہ بات روز روشن کی طرح سب پر عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالےٰ ایک صاحبِ ایمان اقلیت بلکہ مٹھی بھر نوجوانوں کو جو ہر طاقت سے عاری اور ہر ہتھیار سے محروم و تہی دست تھے کفر و فسوق کے ایک جم غفیر اور ظلم و استبداد

---

[1] سورۂ براءت ۔ ۱۱۸

کے اس انسانی سمندر سے کس طرح نجات عطا فرماتا ہے، جس کے ہاتھ میں قوت واقتدار کی زمام تھی، اور جو دولت وطاقت کے تمام وسائل وذخائر پر پوری طرح قابض تھا، وہ کس طرح زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو پیدا کرتا ہے، ظلمت کے پردوں سے نور ظاہر فرماتا ہے، اور ان قاتلوں کو جن کے منہ کو خون لگ گیا تھا، اور جو دوسروں کا کلیجہ چبانے پر آمادہ اور اپنے خون کی پیاس اور انتقام کی آگ بجھانے پر مصر تھے، نگہبان و پاسبان، والدین کی طرح شفیق، اور انسانیت کے رحم دل مربی واتالیق بنا دیتا ہے، اور ایمان دار بیٹے کو کافر باپ کا وارث بناتا ہے۔

مکہ کے اہلِ ایمان اور اصحاب کہف میں قدرِ مشترک

اس سخت ونازک گھڑی میں جب مایوسی وبے دلی پوری فضا پر محیط تھی، کلیجے منہ کو آرہے تھے، اور آنکھیں پتھرانے لگی تھیں، قرآن مجید نے مکہ کے اہلِ ایمان کو ایک طرف حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کا نیز حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا وہ قصہ یاد دلایا جو فرد اور جماعت اور ایک نبی اور ان کی قوم کے متعلق ہے، دوسری طرف اصحاب کہف کا یہ قصہ بیان کیا جس میں ایک ظالم وجابر بادشاہ کے سامنے ایمان کے امتحان کی داستان بیان کی گئی ہے، یہ قصے اپنے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے، نیز اپنی شخصیتوں اور کرداروں کے اعتبار سے ضرور مختلف ہیں، لیکن اپنے مقصد میں متحد ومتفق اور اپنے اختتام اور نتیجہ میں ایک دوسرے سے بہت مشابہ اور قریب ہیں، ایک مرکزی نقطہ ان سب میں

پایا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالےٰ کا ارادۂ قاہرہ، جو ایک مومن کو کافر پر، متقی کو فاجر پر، مظلوم کو ظالم پر، کمزور کو طاقتور پر، اور غریب کو امیر پر، اس طرح غالب اور فتحیاب کرتا ہے کہ انسانی عقلیں اس کی توجیہ اور تشریح سے قاصر رہتی ہیں، ایک کافر بھی اس پر ایمان لانے پر مجبور ہوتا ہے، اور شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی سورہ یوسف کے آخر میں اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ [۱]

یقیناً ان لوگوں کے قصہ میں دانشمندوں کے لئے بڑی ہی عبرت ہے، یہ کوئی جی سے گڑھی ہوئی بات نہیں ہے، بلکہ اس کتاب کی تصدیق ہے، جو اس سے پہلے آچکی ہے، نیز ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں (ہدایت کی) ساری باتوں کی تفصیل ہے (یعنی الگ الگ کر کے واضح کر دینا ہے) اور رہنمائی ہے اور رحمت ہے!

سورہ ہود کے آخر میں آتا ہے:۔

وَكُلًّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ [۲]

اور (اے پیغمبر!) رسولوں کی سرگزشتوں میں جو جو قصے ہم تجھے سناتے ہیں (یعنی جن جن اسلوبوں سے ہم سناتے ہیں) تو ان سب میں یہی بات ہے کہ تیرے دل کو تسکین دیدیں، اور

---

[۱] سورہ یوسف ۔ ۱۱۱ [۲] سورہ ہود ۔ ۱۲۰

پھر ان کے اندر تجھے امر حق مل گیا (یعنی
سچائی کی دلیلیں مل گئیں) اور موعظت
(کہ نصیحت پکڑنے والے نصیحت پکڑیں گے)

اور یاد دہانی ہوئی مومنوں کے لئے!

جب ہم مکہ کے مسلمانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان میں اور اصحاب کہف میں بڑی مشابہت نظر آتی ہے، اصحاب کہف نے اپنے دین و ایمان کو فتنہ سے بچانے کے لئے شہر چھوڑ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی تھی، وہ ایک طویل عرصہ تک وہاں مقیم رہے، یہاں تک کہ ظالم و جابر حکومت جو اہلِ ایمان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہی تھی، ختم ہوئی اور روما کے تخت پر بت پرستانہ وظالمانہ حکومتوں کے طویل سلسلہ کے بعد — ایک ایسا شخص متمکن ہوا جو دین مسیحی کا حامی اور داعی تھا، اور اس کی طرف اپنے انتساب پر فخر کرتا تھا، اور چاہتا تھا، کہ ہر اس شخص کی پوری قدردانی اور عزت افزائی کرے جو ان مظالم کا شکار رہا ہے، اور اس کو عظمت و تقدس کے اس مقام پر پہونچا دے جو اس کا حق ہے۔

مکہ کے مسلمان بھی اپنے دین پر اس طرح صبر و استقامت کے ساتھ قائم رہے جیسے کوئی شخص اپنی مٹھی میں انگارا لئے ہوئے ہو، اور کسی تپتے اور دہکتے ہوئے پتھر پر کھڑا ہو، بالآخر نجات کی صورت پردۂ غیب سے ظاہر ہوئی اور ان کو ہجرت کی اجازت ملی، اور وہ بھی اس محفوظ قلعہ اور مضبوط غار میں پناہ گیر ہوئے جس کا نام یثرب ہے، البتہ ان کے ساتھ اللہ تعالٰے کو اس سے کچھ زیادہ منظور تھا، جتنا ان صاحب ایمان نوجوانوں کے ساتھ جو دوسری صدی عیسوی میں غار میں پناہ گزیں ہوئے تھے

فیصلۂ الٰہی یہ تھا کہ ان کے ذریعہ اس کا دین پورے روئے زمین پر غالب آئے اور بحر و بر کا کوئی حصہ اس کے ابرِ رحمت سے محروم نہ رہے :-

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ [1]	وہ اللہ ایسا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دیکر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کردے گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

چنانچہ اس نے بعثتِ محمدی کو (جس پر نبوت کا سلسلہ تمام ہوا) پوری امت کی بعثت کا ذریعہ بنا دیا :-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ [2]،	(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) تم تمام امتوں میں "بہتر امت" ہو جو لوگوں (کی ارشاد و اصلاح) کے لئے ظہور میں آئی ہے تم نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے، اور اللہ پر (سچا) ایمان رکھنے والے ہو۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین [3]،	تم سہولت پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے تنگی و سختی کرنے والے بنا کر نہیں۔

اس مومن اقلیت کے لئے یہ تنگ و محدود غار بالکل ناکافی تھا جس میں وہ زندگی کے دھارے سے کٹ کر اپنی زندگی کے دن پورے کرے جب کہ دعوتِ اسلامی

---

[1] سورہ صف ـ ۹ [2] سورہ آل عمران ـ ۱۱۰ [3] روایت حضرت ابوہریرہؓ (ترمذی)

کا پورا انحصار اس پر تھا، انسانیت کا مستقبل اس کے ساتھ وابستہ تھا حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان میں یہ امت زمین کا نمک تھی، اس معمولی تخم پر ان سرسبز و شاداب کھیتوں کا دار و مدار تھا، جس میں انسانیت کی زندگی اور بنی نوع انسان کی بقا و فلاح کا راز پوشیدہ ہے، اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ تھا کہ یہ اقلیت ضائع نہ ہو، بیداری کے بعد پھر نیند کا شکار نہ ہو، عزلت و گوشہ نشینی کی زندگی نہ گزارے بلکہ خدا کے دین کی کھل کر دعوت دے، باطل کا علانیہ مقابلہ کرے، انسانیت کو ظلم و استبداد کے شکنجہ سے آزاد کرائے اور اللہ کا نام اور کلمہ ہر چیز پر غالب اور بلند کرے:۔

حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ[1] — یہاں تک کہ ظلم و فساد باقی نہ رہے، اور دین کا سارا معاملہ اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔

اصحاب کہف کے قاصد جب اپنے غار سے نکل کر شہر گئے تو ان کو ایک نئی دنیا نظر آئی، لوگ بھی مختلف اور ان کی تہذیب و تمدن بھی مختلف اور ان کا مذہب بھی مختلف، انھوں نے دیکھا کہ ان ہی کا دین اس ملک میں حکمراں اور غالب ہے اور ان کے عقائد احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، اسی طرح جب مہاجرین مدینہ سے مکہ آئے تو مکہ نے خندہ پیشانی کے ساتھ ان کا استقبال کیا، اب وہاں اسلام کا جھنڈا لہرا رہا تھا، بیت اللہ کی کلید رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھی، آپ کو اختیار تھا جس کو چاہیں عنایت فرمائیں، ہر قسم کی عزت و شرافت اسلام کے اندر سمٹ کر آ گئی تھی، اور شرک و بت پرستی ذلت و تحقیر کے ہم معنیٰ بن گئی تھی، کل کے نکالے ہوئے آج کے حاکم، انسانیت کے معلم اور

---

[1] سورہ انفال۔ ۳۹

قافلۂ انسانی کے رہبر و رہنما تھے۔

اس لحاظ سے دیکھئے تو اصحاب کہف کا یہ قصہ مکہ کے اہل ایمان اور نوجوان مہاجرین کی زندگی سے کس قدر مشابہ ہے، جو تھوڑا بہت فرق ہے، وہ اسلام کے مزاج عام اور انسانی ضروریات و تغیرات کا لازمہ اور قدرتی نتیجہ ہے۔

تاریخ اپنے کو بار بار دہراتی ہے

اللہ تعالیٰ نے اس دین کے لئے ابدیت اور اشاعت عام اور اس امت کے لئے بقائے دوام کا فیصلہ فرمایا ہے، اور اس کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ ان تمام مرحلوں سے گزرے جن سے گذشتہ قومیں تاریخ کے مختلف زمانوں میں گزری تھیں، اور اس کی دعوت کو ان تمام قدرتی اور طبعی چیزوں کا سامنا کرنا پڑے جو انسانی زندگی میں پیش آتی رہتی ہیں، اس کو کبھی قوت حاصل رہی، کبھی کمزوری، کبھی کثرت کبھی قلت کبھی موافقت کبھی مخالفت کبھی فتح اور کبھی ہزیمت، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر وہ جماعتیں جو دعوت کی علمبردار ہیں، اور عقائد صحیحہ پر قائم ہیں، سخت ترین مظالم کی شکار ہوتی ہیں، ان کو ایذا رسانی اور جلا وطنی کی طرح طرح کی قسموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کبھی یہ غیر مسلم حکومتوں میں ہوتا ہے، اور کبھی ان حکومتوں کے زیر سایہ جنکو اسلامی حکومتیں کہا جاتا ہے، اور جس کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، جو کلمہ گو کہلاتے ہیں، جو بڑی بڑی مسجدیں تعمیر کرتے ہیں، میلاد اور شب معراج کے شاندار جلسے کراتے ہیں، بہت شان و شوکت کے ساتھ عید مناتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اسلام کی دعوت اور عقائد صحیحہ کو اپنے وجود و سالمیت اور اپنے

استحکام وبقا کے لئے اکثر جاہلی تحریکوں، مشرکانہ خرافات اور ملحدانہ خیالات سے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں، اس وقت اصحاب کہف کا قصہ سرزمین اسلام میں پھر دہرایا جاتا ہے، کمزور و صاحب ایمان اقلیت اور منافق و طاقتور اکثریت کے درمیان کشمکش پھر برپا ہوتی ہے، اور مسلم نوجوان اصحاب کہف کے قصہ سے دوبارہ روشنی، بصیرت اور نشاط حاصل کرتے ہیں:۔

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝[1]	وہ چند نوجوان تھے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے، ہم نے انھیں ہدایت میں زیادہ مضبوط کردیا، اور ان کے دلوں کی (صبر واستقامت میں) بندش کردی وہ جب (راہِ حق میں) کھڑے ہوئے تو انھوں نے (صاف صاف) کہہ دیا، "ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمان وزمین کا پروردگار ہے، ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو پکارنے والے نہیں، اگر ہم ایسا کریں، تو یہ بڑی ہی بے جا بات ہوگی"

کبھی کبھی یہ حالت اتنی سخت اور جان لیوا ہوتی ہے، اور زندگی اور ایمان و عقیدہ کو باہم جمع کرنا اس قدر محال ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اس معاشرہ کو خیرباد کہہ دینے اور عزلت و تنہائی کی زندگی گزارنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا، یہ وہ حالت ہے جو صدیوں اور تاریخ کے طویل وقفوں کے بعد

---

[1] سورہ کہف — ۱۳-۱۴

پیش آتی ہے، لیکن نبوت محمدیؐ نے جو تمام زمانوں کی نبوت ہے، اور ہر قسم کے حالات میں ہماری مکمل رہنمائی کرتی ہے، اس کی نشان دہی بھی کردی ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

یوشك ان یکون خیر مال المسلم غنماً یتبع به شعف الجبال ومواقع القطر یفر بدینه من الفتن[1]	قریب ہے کہ مومن کا بہترین مال بکریاں رہ جائیں جن کو لے کر اپنے دین کو فتنہ سے بچانے کے لئے وہ کسی دامن کوہ میں یا کسی زرخیز وادی میں چلا جائے۔

یہ وہ موقع ہے جہاں سورہ کہف مومن کی مدد کے لئے سامنے آتی ہے، اور وہ راستہ روشن کردیتی ہے، جس پر اس کو جانا چاہیئے۔

اب اصحاب کہف کا قصہ قرآن مجید کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے، یہ ایک ایسا دائرہ یا فریم ہے، جس میں زندگی چلتی جاگتی اور چلتی پھرتی نظر آئے گی، اور مختلف قسم کی عبرتیں اور نصیحتیں ہمیں حاصل ہوں گی۔

بت پرستی والے قیدی کی حکومت میں

رومۃ الکبریٰ کے ایک شہر میں (جس کو آپ افیسس یا افسوس جو چاہیں کہہ سکتے ہیں) مسیحی تاریخ کے آغاز میں مادہ پرستی اور اس کے نتیجہ میں علانیہ بت پرستی اور کھلی ہوئی لذت پرستی اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ چکی تھی، تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے، کہ بت پرستی اور شہوت پرستی کا ہمیشہ اس طرح ساتھ رہا ہے

---

[1] روایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ (بخاری)

جیسے ان دونوں کے درمیان کوئی خفیہ معاہدہ ہو، قدیم ہندوستان کے کھنڈر
اور تاریخی مقامات کی کھدائی سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اور یونان و مصر اور
عرب کے عہد جاہلیت میں بھی یہی بات نظر آتی ہے، چنانچہ یہاں بھی یہ قصہ
پیش آیا، بت پرستی اور شہوت پرستی کا تیز رو سیلاب اپنے ساتھ تمام روحانی و
اخلاقی قدروں کو بہالے گیا اور اس سلطنت کے مرکز اور قلب میں ایک ایسی
خالص مادہ پرست سوسائٹی وجود میں آگئی جو ظواہر و محسوسات، وقتی لذتوں
اور عارضی و نقد فائدوں کے سوا کسی اور چیز کی قائل نہ تھی، حکومت قدرتی طور پر
معیشت کے تمام وسائل پر قابض تھی، اور خوشحالی و دولت مندی اور عزت و
اقتدار کا سرچشمہ اور مرکز بن گئی تھی، اس کے عقیدہ و رجحان کو اختیار کرنا اور
اہل حکومت کی نقل ایک ایسا پل تھا، جو بہت آسانی کے ساتھ حکومت و
اقتدار اور عزت و جاہ کی منزل تک پہونچا دیتا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسکے
اردگرد موقع پرستوں اور طالع آزماؤں کا ایک جمگھٹا لگ گیا تھا، اور انسانوں کی
صرف ایک "قطع" یا ایک "ڈیزائن" باقی رہ گیا تھا، یعنی خواہش نفس کے غلام،
کرسیوں کے عاشق اور ریاستوں و جاگیروں پر مرنے والے۔

حکومت بھی اس عقیدہ و رجحان کو اہل ملک پر نافذ کرنے پر مصر تھی اور
اس بے لگام زندگی اور بت پرستانہ نظام کی جو بھی مخالفت کرتا اس کا تعاقب
کرتی، کبھی اس کو زندگی کی دولت ہی سے محروم کر دیتی، کبھی شہری حقوق چھیننے
پر اکتفا کرتی، پورے ملک میں زندگی کا ایک طرز اور ایک اسلوب بن گیا تھا، جو
خرافات اور شہوت پسندی سے مرکب تھا، اس میں کسی نئے رنگ کی گنجائش

اور عقیدہ و اخلاق میں کسی تنوع کی اجازت نہ تھی اور ملک کے تمام باشندے (اپنے طبقوں، نسلوں، عمروں اور عقلوں کے اختلاف اور فرق کے باوجود) کسی مطبوعہ کتاب کی کاپی بن کر رہ گئے تھے، جس کے کسی نسخہ میں کوئی کمی بیشی یا فرق نہ تھا۔

انقلابی مومن

بت پرستی کی اس ظالمانہ حکومت، حیا سوز معاشرہ دہشت انگیز ماحول اور گھٹی ہوئی فضا میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے، جن کے پاس حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت پہونچی، ان کے نرم دل، زندہ ضمیر اور طبع سلیم نے اس آواز پر لبیک کہا اور پھر یہ دعوت ان کے دل و دماغ پر نہ صرف پوری طرح چھا گئی، بلکہ ان کے لئے ایمان و عقیدہ، لذت و قوت اور یقین و امر بدیہی بن گئی جس کے بغیر ان کے لئے زندگی گزارنا مشکل تھا، اور جس کو وہ بڑی سے بڑی قیمت پر بھی فروخت کرنے کے لئے تیار نہ تھے خواہ اس کے بدلہ میں ان کو اپنی جان ہی سے ہاتھ دھونے پڑیں۔

یہ وہ جگہ تھی، جہاں یہ کشمکش سب سے پہلے برپا ہوئی، سب سے پہلے یہ کشمکش خود ان کے دلوں میں پیدا ہوئی اس کے بعد اس کے اثرات باہر تک پہونچے (اور اصولاً بھی یہی ہے کہ اس قسم کی کشمکش سب سے پہلے آدمی کے اپنے دل میں پیدا ہوتی ہے) انھوں نے حکومت کی بالکل مختلف اور متوازی سمت میں چلنا شروع کیا، حکومت بت پرست تھی، اور اس کے سوا کچھ اور ماننے اور سننے کی روادار نہ تھی، سوسائٹی گندی تھی، اور گندگی کے سوا کسی اور چیز پر راضی

نہ تھی، اور اس حکومت اور معاشرہ کی رضامندی کے بغیر زندگی گزارنا آسان کام نہ تھا، اسباب و مسببات کا فلسفہ، تہذیب اور معاشرہ کا مطالعہ اور زندگی کے آشکارا حقائق سب ان پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ حکومت اور معاشرہ کے سامنے سپر ڈال دیں، اس لئے کہ کھانے کے بغیر پیٹ نہیں بھر سکتا، اور کھانا بغیر روپیہ کے نہیں مل سکتا، اور روپیہ صرف حکومت وقت کے پاس ہے، عزت و نیکنامی صرف جاہ سے حاصل ہو سکتی ہے، اور جاہ بغیر سرکاری نوکری اور افسری کے ہاتھ نہیں آتا اور نوکری صرف حکومت کے اختیار میں ہے، عافیت، سکون اور سلامتی صرف زمانہ سازی اور سوسائٹی کی موافقت و حمایت میں ہے، اور یہ موافقت و اتحاد رائج الوقت عقائد اور رجحان عام کی پیروی کے بغیر ممکن نہیں، یہ وہ مادی منطق اور طرز استدلال ہے، جو انسانی مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہے، اور اس طرح کے تمام معاملات میں یہی نفسیات کارفرما نظر آتی ہے۔

لیکن یہ لوگ بظاہر اس کھلی ہوئی اور صاف منطق کی بھی مخالفت کرتے ہیں، جو اس کے داعیوں اور حامیوں کی نگاہ میں دو دو چار کی طرح یقینی اور آسان ہے، وہ اپنے ایمان اور عقیدہ سے رہنمائی اور مدد حاصل کرتے ہیں، اور اس وقت ان کی دوررس و عمیق نگاہ حاضر و موجود کے پردوں کو چاک کر کے بہت آگے پہونچتی ہے، اور ان کے سامنے وہ نقشہ آتا ہے، جو شہود سے ماوراء ہے، وہ دیکھتے ہیں، کہ ان اسباب و وسائل کے سوا جن پر یہ حکومتیں قابض ہیں، اور جو سوسائٹی کے تصرف میں نظر آتی ہیں، ایک سبب اور ہے، اور وہ ارادۂ الٰہی

ہے، جس نے خود ان اسباب کو پیدا کیا ہے، اور تنہا اسی کی مشیت پردہ کے پیچھے سے اس کو چلا رہی ہے، یہ مشیت جس کے ساتھ ہو جاتی ہے، اس پر اسباب یا اسباب والے مطلق اثر انداز نہیں ہوتے، اور وہ ان کا کبھی محتاج نہیں ہوتا، اللہ تعالےٰ حالات اور زمانہ کی رفتار اور چال تک کو اس کے تابع اور اس کی ضرورت اور حال کے مطابق بنا دیتا ہے، اس کے سارے کاموں اور معاملات میں غیر معمولی سہولت، کشادگی اور آسائش پیدا کرتا ہے، اور اسکو اپنی خصوصی رحمتوں و نعمتوں سے نوازتا ہے، اس لئے اس کو ظاہری اسباب کے سامنے سر جھکانے اور ان غریبوں اور کمزوروں کے در پر جبہہ سائی کرنے اور ذلیل ہونے کی ضرورت نہیں، صرف عقیدہ پر مضبوطی اور ثابت قدمی ضروری ہے۔

یہ وہ موقع ہے، جب ایمان مادیت پر اور منطقِ ایمانی منطقِ برہانی پر پوری طرح غالب آتی ہے، اور یہی سارے قصہ کی جان اور اس کی شاہ کلید ہے:۔

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰـهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝ هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً	وہ چند نوجوان تھے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے، ہم نے انھیں ہدایت میں زیادہ مضبوط کر دیا، اور ان کے دلوں کی (صبر و استقامت میں) بندش کر دی، وہ جب (راہ حق میں) کھڑے ہوئے تو انھوں نے (صاف صاف) کہہ دیا "ہمارا پروردگار تو

لَوْلَا يَأْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا[1]

وہی ہے، جو آسمان وزمین کا پروردگار ہے ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو پکارنے والے نہیں، اگر ہم ایسا کریں، تو یہ بڑی ہی بے جا بات ہوگی"۔

"یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں جو اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کو پکڑے بیٹھے ہیں ـــــ وہ اگر معبود ہیں، تو کیوں اس کے لئے روشن دلیل پیش نہیں کرتے؟ (ان کے پاس تو کوئی دلیل نہیں) پھر اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے، جو اللہ پر جھوٹ کہہ کر بہتان باندھے،،

عقیدہ کے بغیر زندگی یا زندگی کے بغیر عقیدہ

لیکن سوال یہ تھا، کہ جب زمین تنگ ہو چکی ہو، حکومت کے اثر سے ساری آبادی ان کے خلاف ہو، اور معیشت کے اسباب اور رزق کے دروازے بھی بند ہوں اس وقت عقیدہ پر آخر کس طرح قائم رہا جائے، ان کے سامنے یا تو ایسی زندگی تھی، جو عقیدہ و اخلاق سے عاری تھی، یا ایسا عقیدہ جو زندگی اور حریت سے محروم تھا۔

---

[1] سورہ کہف ۔ ۱۳-۱۴-۱۵

یہاں ایمان ان کی دست گیری کرتا ہے، اور ان کے دل میں یہ یقین پیدا کر دیتا ہے، کہ خدا کی زمین بہت وسیع ہے، اور اللہ تعالےٰ کی نصرت پر ان کو پورا بھروسہ کرنا چاہیئے، اور اب جبکہ وہ اپنے تمام فوائد و منافع اور سہولتوں اور لذتوں سے دست کش ہو چکے ہیں، اس مقام پر رہنے کے پابند نہیں ،۔

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ، فَأْوُوْا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا[۱]

(پھر وہ آپس میں کہنے لگے کہ) جب ہم نے ان لوگوں سے اور ان سے جنہیں یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں، کنارہ کشی کرلی، تو چاہیئے کہ غار میں چل کر پناہ لیں، ہمارا پروردگار اپنی رحمت کا سایہ ہم پر پھیلائے گا، اور ہمارے اس معاملہ کے لئے (سارے) سروسامان مہیا کر دے گا۔

ترکِ وطن کا صحیح طریقہ

یہ ہو سکتا تھا، کہ وہ منہ اٹھائے جدھر چاہتے چل دیتے، ہر شخص اپنا راستہ لیتا اور اپنی دنیا الگ آباد کرتا اور ایک ایک غار یا پہاڑ کی چوٹی لیکر بیٹھ جاتا، جس طرح عیسائی اپنی راہبانہ زندگی اور دورِ انحطاط میں ہمیشہ کرتے آئے تھے، لیکن اللہ تعالےٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ سب ایک ساتھ جماعتی طریقہ پر اس شہر کو خیر باد کہیں، اپنے دین و عقیدہ کو سینہ سے لگائے اور

[۱] سورہ کہف ۱۶

حرزجان بنائے ہوئے، خدا کی رحمت کے طلبگار، اور کشائش و کامیابی اور نصر مبین کے منتظر اور امیدوار، یہ وہ مناسب طریقہ اور صحیح راستہ ہے، جو اہلِ ایمان کو ہر اس موقع پر اختیار کرنے کی ضرورت ہے، جب زمین ان پر تنگ ہو چکی ہو، سارے دروازے ان کے لئے بند کر دیئے جائیں، اور ان کی سب سے قیمتی دولت، دین و ایمان کے ضائع ہونے کا پورا اندیشہ اور خطرہ ہو۔

ایمان و جوانمردی اور فرار الی اللہ کا انعام

اس کے نتیجہ میں کیا ہوتا ہے؟ ایمان و جوانمردی کی شرط جب وہ پوری کر دیتے ہیں، جو نصرت الٰہی اور تائید غیبی کے دستور کی دو بنیادی صفتیں ہیں، یعنی (انھم فتیۃ آمنوا بربھم (...... وہ کچھ نوجوان تھے، جو اپنے رب پر ایمان لائے) تو اللہ تعالےٰ بھی ان کے حق میں اپنے سارے وعدے پورے فرماتا ہے، جس کو اس نے ہدایت اور ثابت قدمی میں زیادتی و اضافہ سے تعبیر کیا ہے:-

وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ۝ وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ [1]

ہم نے انھیں ہدایت میں زیادہ مضبوط کر دیا اور ان کے دلوں کی (صبر و استقامت میں) بندش کر دی۔

ایک مسلمان مہاجر کو جو اپنی سوسائٹی اور ماحول سے بغاوت کرتا اور آمرانہ حکومت اور مادی طاقت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے،

---

[1] سورہ کہف ۱۳-۱۴

ہدایت وثابت قدمی کی سب سے زیادہ احتیاج ہوتی ہے، اور اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ اس کے خائف اور مضطرب دل کو سکون اور قوت عطا فرمائے، ان شریف وباہمت نوجوانوں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا، اور ان کو مزید ہدایت سے نوازا، ان کا دل اونچا رکھا اور بزدلی اور خوف اور حیرت واضطراب کو شجاعت وسکینت، قوت واعتماد اور مسرت وانبساط اور تسلیم ورضا کی شان سے بدل دیا، اور یہی راہ خدا کے ہر اس مہاجر کا زاد سفر اور مجاہد فی سبیل اللہ کا ہتھیار رہے، جو بے خدا معاشرہ کا باغی اور اپنے عہد اور زمانہ سے برسر پیکار رہے۔

پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ جب وہ اپنا مستقر اور شہر چھوڑ کر اور تمدن کی تمام رنگینیوں اور شہر کی دلچسپیوں سے منہ موڑ کر اور اسباب معیشت سے دست کش ہو کر نکل کھڑے ہوئے، اپنا وطن عزیز اور اپنا وہ محبوب وباعزت گھرانہ بھی انکو چھوڑنا پڑا جو بڑا شریف ونیکنام اور عالی نسب تھا[1]۔

تو اس کا انعام اور بدلہ ان کو یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے کشادہ اور صحت وطب کے لحاظ سے موزوں ترین غار[2] کی طرف ان کی رہنمائی کی کہ بڑی بڑی تنظیمیں مل کر بھی کوئی ایسی وسیع، لطیف، اور صحت مند پناہ گاہ تعمیر نہیں کر سکتیں

---

[1] علامہ آلوسی نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ نوجوان رومیوں کے اشراف اور سربرآوردہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے (روح المعانی ج ۵ ص۱۱)

[2] لسان العرب میں ہے کہ کہف پہاڑ کے غار کو کہتے ہیں، فرق یہ ہے کہ اگر زیادہ کشادہ اور بڑا ہوگا تو اس کو کہف کہا جائے گا، تنگ اور چھوٹا ہوگا تو اسکو المغارہ کہیں گے،

اس کی شان یہ تھی کہ سورج کی روشنی اور گرمی اس میں ضرور پہونچتی تھی لیکن اسکے مضر اثرات (یعنی ضرورت سے بڑھی ہوئی حرارت اور تپش) سے وہ محفوظ رہتا تھا، دوسری طرف تازہ اور پاکیزہ ہوا ان کو زندگی و نشاط سے مالامال کرتی تھی،۔

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ[1]

اور وہ جس غار میں بیٹھے، وہ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ جب سورج نکلے تو تم دیکھو کہ ان کے داہنے جانب سے ہٹا ہوا رہتا ہے، اور جب ڈوبے تو بائیں طرف کترا کر نکل جاتا ہے (یعنی کسی حال میں بھی اس کی شعاعیں اندر نہیں پہنچتیں) اور وہ اس کے اندر ایک کشادہ جگہ میں پڑے ہیں۔

اس طرح اس متعفن اور نجس تہذیب اور اس کے ظالم و بدکردار علمبرداروں اور حامیوں سے ان کا رشتہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا، اور زندگی کے قدرتی اسباب و وسائل اور پاک و نظیف بیرونی دنیا سے استوار ہوگیا، وہ دنیا سے کنارہ کش بھی تھے، لیکن اس کے تمام منافع اور سہولتوں اور آسائشوں سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے، اور یہ صرف ایمان محکم اور جہاد صادق کا ثمرہ اور لطف الٰہی اور ہدایت ربانی

---

[1] سورہ کہف۔ ۱۷۔ روح المعانی میں ہے کہ ان کو دھوپ سے اصلاً واسطہ ہی نہ پڑتا تھا کہ انکو کچھ تکلیف ہوتی، وہ غار کے وسط میں تھے تازہ ہوا انکو حاصل ہوتی تھی، اور غار کی تکلیف و تنگی اور سورج کی سوزش و تپش سے وہ محفوظ تھے (ج ۵ صـ۲۰) امام رازی نے لکھا ہے کہ غار کا دروازہ شمال کی جانب کھلتا تھا جب سورج طلوع ہوتا تو غار کے داہنی طرف ہوتا جب غروب ہوتا تو شمال کی طرف ہوتا، ج ۵ صـ۶۶۴

کا کرشمہ ہے:۔

ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ[1]

یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے (کہ انھوں نے حق کی خاطر دنیا اور دنیا کے سارے علاقے چھوڑ دیئے) جس کسی پر وہ (کامیابی کی) راہ کھول دے، تو وہی راہ پر ہے۔

خدا کی قدرت اور شریعت کے منکروں اور فطرت اور کائنات کے باغیوں اور سرکشوں نے ہمیشہ اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اور سارا علم اور ذہانت اس بات پر صرف کی کہ شیریں، خوشگوار، اور صاف و شفاف چشمۂ حیات کا کوئی جرعہ ان کے نصیب میں آجائے اس کے لئے کائنات کی طاقتوں کی انھوں نے تسخیر کی راحت و آسائش کے تمام وسائل و ذرائع فراہم کئے لیکن نتیجہ سے ہمیشہ محروم رہے، کائنات اور زندگی کے وسائل الٹے ان ہی کے خلاف ہو گئے، اور ان جگہوں سے ان کو ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا، جہاں ان کا وہم و گمان بھی نہ جاتا تھا، اور بالآخر خود اپنے ہی ایجادات و وسائل، مہلک بیماریوں، نئے نئے پیچیدہ مسئلوں اور تباہ کن جنگوں کا شکار ہو کر رہ گئے:۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا[2]

اور جس پر گم کردے راہ تو تم کسی کو اس کا کارساز اس کا راہ دکھانے والا نہ پاؤ گے!

---

[1] سورہ کہف۔ ۱۷ [2] ایضاً

ایمانی غار کی زندگی

اس ایمانی غار میں اپنی زندگی انھوں نے تعطل و بے عملی میں نہیں گزاری وہ وہاں نہ ظلمت یا بے بصری میں مبتلا تھے، اور نہ خدا کے قانون و ہدایت نامہ سے محروم تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ بعض صحیفے اور لکھے ہوئے اوراق (جو شائد تورات وانجیل سے متعلق ہوں) اور علوم نبوت کے آثار باقیہ وہ شہر چھوڑتے وقت اپنے ساتھ لیتے آئے تھے[1] اور یہ ایک ایسا نمونہ ہے جس پر اپنے ماحول و معاشرہ سے تمام بغاوت کرنے والے اور تمام مہاجر اور پناہ گیر اس وقت عمل کر سکتے ہیں،

---

[1] قرآن ان لوگوں کا ذکر اصحاب الکہف والرقیم کے ساتھ کرتا ہے، رقیم کی تفسیر میں مفسرین کی مختلف رائیں ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر کی سل ہے جس پر ان کا قصہ یا انکے نام لکھے ہوئے ہیں، اور جو غار کے دروازہ پر ایستادہ ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ گاؤں یا شہر کا نام ہے، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنے مضمون میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ وہ لکھے ہوئے صحیفے یا اوراق ہیں، جو غار میں ان کے مونس و رفیق تھے، ان کے اس خیال کی تائید عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے ہوتی ہے، جو صاحب روح المعانی نے نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں، کہ وہ دراصل ایک کتاب تھی، جو ان کے پاس تھی، اس میں دین عیسوی کی تعلیمات درج تھیں (ج ۵ ص ۱۱) اور ہمارے نزدیک زیادہ قابل ترجیح بات یہی ہے، ابن جریر نے بھی اپنی سند سے ابن زید سے روایت کی ہے کہ "رقیم کتاب کو کہتے ہیں" اور اس کتاب کا کوئی خاص راز یا معاملہ ہے، جو اللہ تعالٰی نے مخفی رکھا ہے، اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی "ما ادراک ما علیون کتاب مرقوم یشھدہ المقربون" (ج ۱۵ ص ۱۳۲) امام بخاری کہتے ہیں، رقیم کتاب کو کہتے ہیں،

جب عزلت وہجرت کا موقع ہوا اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے،

جب زادراہ اور ذخیرہ جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے ختم ہوگیا تو اللہ تعالےٰ نے ان کو ایک میٹھی گہری اور طویل نیند کی آغوش میں پہونچا دیا، اور کھانے پینے کی احتیاج بھی باقی نہ رہی:۔

فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝ [1] — تو ہم نے انھیں اسی غار میں تھپک کر چند سال کیلئے گہری نیند سلادیا۔

روم میں حالات کی تبدیلی

اب اصحاب کہف کے معجزانہ واقعات میں سے سب سے بڑا معجزہ ظاہر ہوتا ہے، ان کی نیند اور گوشہ نشینی کے دوران ان کے شہر پوری مملکت اور اس کے ماتحت علاقوں میں حالات یکسر تبدیل ہوجاتے ہیں، بت پرستی اور شہوت پرستی کی بساط الٹ جاتی ہے، اور زمانہ کا حافظہ اسکے بڑے بڑے علمبرداروں کے نام تک فراموش کردیتا ہے، اور اس بت فروش اور حیا سوز معاشرہ کے ملبہ پر ایک ایسی حکومت اور معاشرہ وجود میں آتا ہے، جو اللہ تعالےٰ پر اور مسیح علیہ السلام [2] پر ایمان

---

[1] سورہ کہف۔ ۱۱ [2] یہ قسطنطین اکبر کے عہد کا واقعہ ہے جسنے ۳۰۶ء میں زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی اور عام روایت کے مطابق عیسائیت قبول کرلی تھی (بہت سے مورخ اسکے اخلاص اور درستی نیت میں شک کرتے ہیں، ان کے نزدیک اس نئے مذہب کو اختیار کرنا سیاسی مصالح کیلئے تھا) اور ملک کا سرکاری مذہب بھی عیسائیت کو قرار دیا تھا، اس نے عقیدۂ عیسائیت میں اتحاد و ہم آہنگی پیدا کرنے اور مذہبی اختلافات اور فرقہ بندیوں کو ختم کرنیکے لئے پادریوں کی کئی اہم مجلسیں منعقد کی تھیں، یہی حکمراں ہے جس نے ۳۳۰ء میں قسطنطنیہ کا شہر آباد کیا جو اسکے نام سے موسوم ہے اور جو اسکی حکومت کا پایۂ تخت تھا، اسکا انتقال ۳۳۷ء میں ہوا

رکھتا تھا، اور اس نئے مذہب کا پرجوش وکیل اور داعی تھا، جس سے گذشتہ حکومتیں طویل عرصہ تک برسرِ جنگ رہیں، اور اس کے نمائندوں اور پیروؤں کو جلا وطن کرتی رہیں، اور طرح طرح سے ستاتی رہیں، اب اس کے بجائے اس مذہب کی طرف انتساب کرنے والوں کی توقیر کی جاتی تھی، اور نہایت گرمجوشی سے ان کا استقبال ہوتا تھا، یہ وہ موقع ہے، جب اصحاب کہف اپنی طویل نیند سے بیدار ہوتے ہیں، جو تین سو برس سے زیادہ سے ان پر طاری تھی:-

وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ؁[1] — اور وہ لوگ اپنے غار میں تین سو برس تک رہے، اور نو برس اوپر اور رہے۔

وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ ہم لوگ کتنی دیر سے سو رہے تھے اس طویل وقفہ کے اندازہ اور تعین میں وہ مختلف رائے ظاہر کرتے ہیں، پھر معاملہ خدا پر چھوڑ دیتے ہیں، اس لئے کہ ان باتوں پر نہ دین کا انحصار ہے نہ دنیا کا:-

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؁[2] — ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا "ہم یہاں کتنی دیر تک رہے ہوں گے؟" سب نے کہا "ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ" پھر (جب ٹھیک ٹھیک مدت معلوم نہ کر سکے تو) بولے ہمارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کتنی دیر تک پڑے رہے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ان کو بھوک لگتی ہے، اپنے ایک ساتھی کو وہ اس پر متعین

---

[1] سورہ کہف - ۲۵ [2] ایضاً - ۱۹

کرتے ہیں کہ وہ کہیں سے اچھے اور پاکیزہ کھانے کا بندوبست کرے، جو چاندی کے سکے وہ اپنے ساتھ لیتے آئے تھے، وہ اس کے حوالہ کرکے شہر روانہ کرتے ہیں۔

فَابْعَثُوا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ ؕ۲	اچھا ایک آدمی کو یہ سکے دے کر شہر میں بھیجو، جا کر دیکھے کس کے یہاں اچھا کھانا ملتا ہے اور جہاں کہیں سے ملے تھوڑی بہت غذا لے آئے،

ان کی دانست میں حکومت ابھی تک دشمنوں کے ہاتھ میں تھی اور جاسوس سپاہی ہر طرف ان کے تعاقب میں پھیلے ہوئے تھے، اس لئے انھوں نے جاتے وقت اپنے ساتھی کو احتیاط اور نرمی سے کام لینے کی خاص طور پر ہدایت کی:۔

وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْا اِذًا اَبَدًا ۝۳	اور ہاں، چپکے سے لائے کسی کو ہماری خبر نہ ہونے پائے، اگر لوگوں نے خبر پالی تو وہ چھوڑنے والے نہیں، یا تو سنگسار کریں گے، یا مجبور کریں گے کہ پھر ان کے دین میں واپس چلے جائیں اگر ایسا ہوا تو پھر کبھی تم فلاح نہ پاسکو گے۔

دوسری طرف اہل شہر بت پرستوں کے عہد حکومت میں ان خدا پرست نوجوانوں پر ظلم و زیادتی کے قصہ سے اچھی طرح واقف تھے، ان کو اس کا علم تھا کہ ان کے ساتھ کیا ماجرا ہوا اور وہ کس طرح اچانک روپوش ہو گئے کہ ان کے نام و نشان کا پتہ تک

---

۱ امام رازی نے اَزْكٰى طَعَامًا کی تفسیر میں لکھا ہے کہ زیادہ پاکیزہ اور مزے دار اور یہ لکھا ہے کہ اس آیت سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زادِ راہ اور غذا کا انتظام شریعت الٰہی میں ثابت و مسلم ہے اور اس سے توکل کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ ۲ سورہ کہف۔ ۱۹ ۳ ایضاً ۱۹-۲۰

نہ چلا، عیسائی حکومت نئی اور تازہ دم تھی، اور عیسائیت کے آثار و نشانات کو پھر سے اجاگر کرنا چاہتی تھی، اور اس کے خاص رہنماؤں، قربانی دینے والوں اور شہیدوں کے کارنامے دوبارہ زندہ کرنا چاہتی تھی، اور اس فکر میں تھی کہ ان کی کوئی بڑی یادگار قائم کرے، اور ان لوگوں میں اصحاب الکہف والرقیم قدرتی طور پر اس کی نظر میں سب سے پہلے آتے تھے۔

کل کے جلاوطن آج کے ہیرو

نتیجہ یہ ہوا کہ اصحاب کہف کا قصہ پورے شہر کا موضوع بن گیا، انکا فرستادہ چھپتے چھپاتے، نظریں بچاتے، مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوا، وہ جلد سے جلد کوئی لذیذ و پاکیزہ کھانا لے کر الٹے پاؤں واپس آنا چاہتا تھا کہ اچانک وہ پورے شہر کی نگاہوں کا مرکز بن گیا اور وہ اور ان کے سارے ساتھی دیکھتے دیکھتے ہیرو قرار دیدیئے گئے اور سرکاری وغیر سرکاری دونوں سطح پر ان کے جہاد و قربانی اور عزیمت کے نغمے گائے جانے لگے۔

سب سے پہلے ان قدیم سکوں نے (یا اس قدیم لہجہ اور مخصوص پوشاک نے) ان کا راز فاش کیا لیکن قرآن مجید ان تفصیلات سے زیادہ سروکار نہیں رکھتا، اس لئے کہ اس کا موضوع ہدایت ہے قصہ و داستان گوئی نہیں، پورے شہر بلکہ ملک کے تمام حصوں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل جاتی ہے اور اس کے سوا کوئی موضوع سخن باقی نہیں رہتا، ہر مجلس میں اس کا چرچا اور ہر گھر میں اس کا ذکر ہوتا ہے، لوگ پارٹیاں بنا بنا کر اس غار کی زیارت کے لئے جہاں انھوں نے پناہ لی تھی، جاتے ہیں،

قرآن مجید اپنے معمول کے مطابق یہاں بھی ان کے استقبال اور لوگوں کی گرمجوشی اور عزت افزائی کے ذکر سے گریز کرتا ہے، لیکن بڑی قوت اور تاکید کے ساتھ اس کا اعلان کرتا ہے کہ:۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا[۱]

اور (پھر دیکھو) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے لوگوں کو ان کے حال سے واقف کر دیا (ان کی بات پوشیدہ نہ رہ سکی) اور اس لئے واقف کر دیا کہ لوگ جان لیں، اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں!

یہ انقلاب جو حکومت اور عوام دونوں میں برپا ہوا اور اتنے طویل عرصہ تک غائب رہنے کے بعد یہ لوگ جس طرح دریافت ہوئے ان سب باتوں میں دراصل اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کی تکمیل تھی، جو ان کے آثار کو نقش جاوداں بنانے اور ان کے دشمنوں کو ناکام و مغلوب کرنے کے سلسلہ میں کیا گیا تھا، اور اس بات کی دلیل کہ گردش لیل و نہار اور اقبال و ادبار سب اللہ کے ہاتھ میں ہے:۔

وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِى الْقُبُوْرِ[۲]

بلاشبہ مقررہ گھڑی آنے والی ہے اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں اور اللہ ضرور انھیں اٹھا کھڑا کرے گا، جو قبروں میں پڑ گئے (یعنی مرگئے)

---

[۱] سورہ کہف ۔ ۲۱ [۲] سورہ حج ۔ ۷

کیا اس وقت کوئی توقع کرسکتا تھا کہ ظلم واستبداد کی حکومت ایک دن اس طرح ختم ہوگی، مظلوم عیسائیت کا دوبارہ احیا ہوگا، اصحاب کہف اتنے طویل زمانہ کے بعد اپنے اس غار سے (جس کو ایک وسیع مقبرہ بھی کہہ سکتے ہیں) برآمد ہوں گے اور تقدیس وتعظیم کا ایک ہالہ ان کے گرد قائم ہو جائے گا، حکومت کی آغوش بھی ان کے لئے وا ہوگی، اور شہر والے بھی ان کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور دیدہ ودل ان کے لئے فرش راہ کریں گے، کیا اس میں قریش کے سرداروں اور مکہ کی سربرآوردہ شخصیتوں نے کوئی سامان عبرت اور کمزور وستم رسیدہ مسلمانوں کے لئے کوئی وجہ تسلی اور پیغام امید نہیں ہے؟

یہ نوجوان جب تک اللہ تعالےٰ کو منظور تھا زندہ رہے، پھر ان کا انتقال ہوا اور عقیدتمندوں اور محبین ومخلصین میں ان کی یادگار قائم کرنے کے سلسلہ میں یہ اختلاف پیدا ہوا کہ اس کی کیا شکل ہونی چاہیئے، اور کیا چیز اس کے لئے زیادہ موزوں ہوسکتی ہے:۔

اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا	اسی وقت کی بات ہے کہ لوگ آپس میں بحث
ابْنُوا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۚ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ	کرنے لگے، ان لوگوں کے معاملہ میں کیا کیا جائے
قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ	لوگوں نے کہا "اس غار پر ایک عمارت بنادو
لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ۝[1]	کہ یادگار رہے، اس سے زیادہ اس معاملہ کے

[1] سورہ کہف ۔ ۲۱ علامہ آلوسی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں "اس آیت سے بعض لوگوں نے بزرگوں کی قبروں پر عمارت تعمیر کرنے اور اس پر مسجد بنانے کے جواز پر استدلال کیا ہے، جو نہایت درجہ لغو وباطل قول ہے شیخین اور نسائی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے، (باقی ص۶۹ پر)

پیچھے نہ پڑو) ان پر جو کچھ گزری، ان کا پروردگار
ہی اسے بہتر جانتا ہے" تب ان لوگوں نے کہا کہ جو
معاملات پر غالب آگئے تھے: "ٹھیک ہے ہم ضرور
ان کے مرقد پر عبادت گاہ بنائیں گے،،

یہ گرمجوشی صرف ان کے زمانہ تک اور صرف ان کی تعمیری یادگار تک محدود نہ رہی بلکہ تاریخ اور مذاہب میں ان کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید ہوگیا، اس پر مباحثے اور اختلافات ہوئے، متعدد گروہ اور فرقے قائم ہوگئے اور مختلف مکاتب خیال وجود میں آئے اور ہمیشہ یہ سب کا محبوب موضوع رہا:۔

سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ج وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًام بِالْغَيْبِ ج وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ط قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ قف

کچھ لوگ کہیں گے، غار والے تین آدمی تھے، چوتھا ان کا کتا تھا، کچھ لوگ ایسا بھی کہتے ہیں، نہیں پانچ تھے، چھٹا ان کا کتا تھا، یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں، بعض کہتے ہیں، سات تھے، آٹھواں ان کا کتا (اے پیغمبر!) کہدے" انکی

(باقی ص۶۸ کا) اور مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مساجد بنا لیا" احمد، شیخین اور نسائی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ لوگ قیامت میں اللہ تعالیٰ کی بدترین خلقت میں ہوں گے، آیت میں صرف چند لوگوں کی بات نقل کی گئی جو ایسا کرنے کا ارادہ کررہے تھے، اس سے ان کی تحسین یا انکی پیروی و نقل کا پہلو کسی طرح نہیں نکلتا، جب یہ ثابت نہیں کہ یہ کہنے والے معصوم تھے اسوقت تک ان کا عزم کجا عمل بھی قابل تقلید نہیں، ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس سے مراد سلاطین و امراء ہیں جیسا کہ حضرت قتادہؓ سے مروی ہے" (روح المعانی ج ۵ ص۳۱ و ص۳۲)

فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ۝ؕ[1]

اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے، کیونکہ ان کا حال بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے" (اور جب صورت حال یہ ہے) تو لوگوں سے اس بارے میں بحث ونزاع نہ کر مگر صرف اس حد تک کہ صاف صاف بات میں ہو، اور نہ ان لوگوں میں سے کسی سے اس بارے میں کچھ دریافت کر۔

مادیت پر ایمان کی فتح

یہاں پر سورہ کہف کے چار قصوں میں سے یہ لازوال قصہ ختم ہوتا ہے جس میں ایمان اور مادیت کی کشمکش بیان کی گئی ہے، اور جس کو دوسرے الفاظ میں اسباب پر اعتماد اور خالق اسباب پر اعتماد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، یہ قصہ مادیت پر ایمان کی فتح اور خالق اسباب پر اعتماد کامل اور صدق ویقین پر ختم ہوتا ہے۔

ان ایماندار اور سچے نوجوانوں نے مادیت پر ایمان کو ترجیح دی، فوری نفع اور نقد فائدہ پر آخرت کے وعدہ کو مقدم رکھا۔ انھوں نے ایمان کے ساتھ غربت وافلاس کی زندگی کو پسند کیا، لیکن کفر کے ساتھ دولت وامارت کی زندگی گوارا نہ کی، انھوں نے اس کو ترجیح دی کہ وطن، اہل وعیال، اور دوست احباب سے دور رہیں اور زندگی کی ہر لذت اور اقتدار کی ہر عزت سے محروم رہیں، لیکن اس کو ایک لمحہ کے لئے گوارا نہ کیا

---

[1] سورہ کہف۔ ۲۲

شرک سے اپنی پیشانی کو داغدار کریں، نفس کے بندے اور خواہشات کے پرستار بنیں، معصیت و سرکشی اور ظلم و زوردستی کے ساتھ تعاون کریں، انھوں نے نفس کے تقاضہ سے زیادہ روح کے تقاضہ اور عقل کے مطالبہ سے زیادہ ایمان کے مطالبہ پر توجہ دی اور جسم و جان کے ساتھ اس میں مشغول ہو گئے، اور بعد میں یہ ثابت ہوا کہ وہی زیادہ دوراندیش، دقیقہ رس اور حقیقت شناس تھے، اور یہ کہ انجام کار اہل تقویٰ کے ہاتھ ہے، انھوں نے اسباب سے خالق اسباب کی طرف راہ فرار اختیار کی اور اس راہ کی ہر تکلیف پر اپنے کو آمادہ کر لیا، یہاں تک کہ اسباب ان کے تابع ہو گئے اور حکومت وقت (جس کے مظالم سے بچنے کے لئے انھوں نے روپوشی اختیار کی) بھی ان کی ہمنوا ہو گئی، اصحاب کہف کا قصہ ایمان و جوانمردی، استقامت و ثابت قدمی اور جہاد و قربانی کا وہ قصہ ہے، جو انسانیت اور حق و عقیدہ کی تاریخ میں بار بار پیش آتا رہا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسباب ارادۂ الٰہی کے تابع ہیں، اور وہ ایمان و عمل صالح کی توثیق و تصدیق کرتے ہیں، اس لئے مومن کا راستہ اور طریقہ صرف یہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ اس ارادہ کو اپنی طرف متوجہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کا مستحق بنے۔

قبل اس کے کہ قرآن مجید اپنے دوسرے قصہ کا (جو دو باغ رکھنے والے) سے متعلق ہے آغاز کرے وہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی وصیت کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رسّی کو، یا اس سب سے طاقتور سبب اور مضبوط کڑے کو جانفشانی کے ساتھ پکڑے رہیں، اور یہی ایمان اور قرآن کا راستہ ہے، وہ آپ کو اس کی نصیحت کرتا ہے کہ آپ ان اہل ایمان کی رفاقت کا التزام رکھیں جو ایمان، معرفت، یقین،

اور ذکر و دعا کی دولت سے سرفراز و خوش نصیب ہیں، خواہ اسباب مادی اور متاع دنیا میں انکا حصہ کم سے کم ہو، ان جاہل و غافل انسانوں سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے جو ایمان، معرفت اور یقین اور اس کے اثرات مثلاً ذکر و دعا وغیرہ سے محروم ہیں، اگرچہ اسباب و وسائل اور دنیا کی نعمتوں کی بہت بڑی مقدار اور ذخیرہ ان کے ہاتھ میں ہے۔

دراصل یہ وصیت عام ہے، اور اس کا مخاطب قرآن مجید کا ہر پڑھنے والا اور ماننے والا ہے بلکہ عام اہلِ ایمان اس کے سب سے زیادہ محتاج ہیں، اور اس پر عمل پیرا ہونے کی سب سے پہلے ان کو ضرورت ہے:۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا[1]

اور جو لوگ صبح شام اپنے پروردگار کو پکارتے رہتے ہیں، اور اس کی محبت میں سرشار ہیں، تو انہی کی صحبت پر اپنے جی کو قانع کرلو، ان کی طرف سے کبھی تمہاری نگاہ نہ پھرے کہ دنیوی زندگی کی رونقیں ڈھونڈنے لگو، جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا (یعنی ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانون نتائج کے مطابق جس کا دل غافل ہو گیا) اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے پڑ گیا، تو ایسے آدمی کی باتوں پر کان نہ دھرو اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔

---

[1] سورۂ کہف ۔ ۲۸

اصحاب کہف، اہلِ ایمان، اور اہلِ معرفت کا ہر زمانہ میں یہ شیوہ اور دستور رہا کہ وہ ایمان وعمل صالح اور خدا سے روحانی تعلق اور نسبت کو ہمیشہ مادی اسباب اور ظاہری شکلوں پر ترجیح دیتے رہے، مادیت اور اس کے علمبرداروں کے خلاف انھوں نے ہمیشہ علم بغاوت بلند رکھا اور دنیا اور زینت دنیا کو کبھی نظر بھر کر نہ دیکھا اور یہی سورہ کہف کا پیغام اور قرآن مجید کی دعوت ہے:۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ[1]

اور یہ جو ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیوی زندگی کی آرائشیں دے رکھی ہیں اور ان سے وہ فائدہ اٹھا رہے ہیں، تو تیری نگاہیں اس پر نہ جمیں، (یعنی یہ بات تیری نگاہ میں نہ جچے) یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ہم نے انھیں آزمائش میں ڈالا ہے، اور جو کچھ تیرے پروردگار کی بخشی ہوئی روزی ہے، وہی (تیرے لئے) بہتر ہے اور (باعتبار نتیجہ کے) باقی رہنے والی۔

دجالی تہذیب میں مادیت اور اسکے علمبرداروں کی عظمت و تقدیس

مادی تہذیب (جس کی نمایاں اور موجودہ شکل کو ہم دجالی تہذیب کہہ سکتے ہیں) اس روح اور اس رجحان یا دعوت کی قدم قدم پر مخالف ہے، بلکہ بالکل متوازی رخ پر چلتی ہے، وہ مادیت اور اس کے علمبرداروں کی عظمت و تقدیس اور ان کی

---

[1] سورہ طٰہٰ ـ ۱۳۱

عقیدت و اطاعت پر قائم ہے، اس کا سارا ادب و فلسفہ (نثر و نظم، صحافت، ناول، ڈرامہ اور تاریخ کی تمام قسموں اور شعبوں کے ساتھ) سرمایہ داروں اور مادی طاقت اور سیاسی و اقتصادی اقتدار رکھنے والوں کی جا و بیجا تعریف اور خوشامد سے بھرا ہوا ہے، اور اس نے ان کو خدا کی طرح برتر و بالاتر اور لاثانی و لافانی بنانے کی کوشش کی ہے، اور ان کی نقل و تقلید، اطاعت و فرماں برداری، اور غلامی کو کفش برداری کی ترغیب دی ہے۔

غلو اور انتہا پسندی اس تہذیب کی خصوصیت ہے

اس انتہا پسند اور ناعاقبت اندیش تہذیب اور اس کے بہترین نمائندوں اور ذمہ داروں کا اس سے بہتر کوئی وصف نہیں ہو سکتا، جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا[1]

جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا (یعنی ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانون نتائج کے مطابق جس کا دل غافل ہو گیا) اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے پڑ گیا، تو ایسے آدمی کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ اور جو ہر معاملہ میں حد سے گزر گیا ہو۔

اسراف، مبالغہ آرائی اور انتہا پسندی اس تہذیب کی علامت اور شعار بن گئی ہے جس سے وہ اور اس کے پیرو کار پہچانے جاتے ہیں، کمانے میں اسراف،

---

[1] سورہ کہف ـ ۲۸

لہو ولعب اور تفریح طبع میں اسراف، خرچ کرنے میں اسراف، سیاسی و معاشی نظریات میں اسراف، جمہوریت ہو تو اس میں غلو، آمریت ہو تو اس میں مبالغہ، اشتراکیت ہو تو اسمیں انتہا پسندی، اپنے خود ساختہ قوانین اور مقرر کردہ اصول اور قدریں ہوں تو اس کی ضرورت سے زائد تقدیس یہاں تک کہ بال برابر اس سے ہٹنا روا نہیں ہوتا اور اس سے انحراف کرنے والا ایسا مجرم سمجھا جاتا ہے، جس کے بعد وہ کسی عزت و شرافت کا مستحق اور کسی احترام کے قابل نہیں رہتا، یا پھر ایسی مجنونانہ اور احمقانہ بغاوت جو عقل، ذوق سلیم اور فطرت انسانی سب کے لئے ناقابل قبول ہے، اور جس کے بعد آدمی متمدن انسانوں کی صف سے نکل کر درندوں اور مویشیوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے[۱]۔

غرض کہ ہر انتخاب اور ہر پسند میں اس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا اور ہاتھ سے نکلا ہوا نظر آتا ہے، اور اس کی ہر تحریک و دعوت میں اس کی کرشمہ سازی

---

[۱] یہ نیا رجحان اور ذہنی رخ یورپ و امریکہ کی ان نئی تحریکوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے جو حیوانی حریت، عریانی اور آزادانہ اختلاط کی داعی ہیں اور جوان دنوں ان مغربی نوجوانوں میں بدرجہ اتم موجود ہے جنکو ہپی (HIPPIES) کہا جاتا ہے، یہ دراصل ہر اس تمدن کا خاصہ ہے جو مادیت کے ہیضہ، فکری بے چینی اور نفسیاتی اکتاہٹ اور مایوسی کا شکار رہے، یونان اور روما میں ایک زمانہ میں اس سے ملتے جلتے حالات پائے جاتے تھے، اس کا اندازہ افلاطون کی کتاب "ریاست" سے بخوبی ہوگا جس میں اس عہد کے ایک ایک یونانی نوجوان کی عکاسی کی گئی ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ص ۲۲۱-۲۲۵ ساتواں ایڈیشن از مؤلف

دیکھی جا سکتی ہے، جہاں تک اعتدال و میانہ روی اور توازن کا تعلق ہے، اس سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں، اور اس کا حصہ اس میں سب سے کم ہے۔

عدل و اعتدال اس دین کا امتیاز ہے

جو زندگی نبوت کے سرچشمہ سے نکلتی ہے اس کا امتیاز عدل اور اعتدال ہے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا	جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں
وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ	نہ بخل، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال پر
قَوَامًا ۝[1]	قائم رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس قرآنی امت کا وصف اعتدال اور توسط بیان کیا ہے۔

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا	اور ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنا دیا ہے
لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ	جو ہر پہلو سے نہایت اعتدال پر ہے، تاکہ
یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا۔[2]	تم (مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو
	اور تمہارے لئے رسول (اللہ صلے اللہ علیہ وسلم)
	گواہ ہوں۔

---

[1] سورہ فرقان۔ ۶۷ [2] سورہ بقرہ ۱۴۳۔ مدارک میں ہے کہ "جس طرح ہم نے تمہارا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان بنایا اسی طرح تم کو افراط و تفریط کے درمیان میں رکھا ہے" ص۲۴ ۔ خازن میں ہے "اس کے معنی یہ ہیں کہ تم کو اس دین کا حامل بنایا جو افراط و تفریط سے پاک ہے"، ج ۱ ص ۱۰۰

خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم توسط اور اعتدال کی کامل مثال تھے[۱]، دین اسلام کا وصف اللہ تعالٰے نے استقامت واعتدال اور افراط و تفریط سے بُعد بیان کیا ہے، اور اس کو کہیں "قیّم" کہا ہے اور کہیں "قِیَم"، نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہے:۔

قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ[۲]۔

کہدو، مجھے تو میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، کہ وہی درست اور صحیح دین ہے ابراہیم کا طریقہ کہ ایک خدا ہی کے لئے ہو جانا اور ابراہیم ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ[۳]۔

یہی ہے سیدھا دین۔

ایک اور جگہ ہے:۔

فَاَقِمْ وَجْھَكَ لِلدِّیْنِ الْقَیِّمِ[۴]۔

سو تم اپنا رخ اس دین راست کی طرف رکھو۔

کتاب اللہ کو بھی قیّم کہا گیا ہے، اور زیغ اور کجی سے اس کو پاک بتایا گیا ہے، اسی سورہ کہف کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

---

[۱] آپ کی میانہ روی واعتدال کے اوصاف وکمالات اور ہر چیز میں میانہ روی اور اعتدال ملحوظ رکھنے کے سلسلہ میں آپکے ارشادات وتعلیمات سیر کی تمام کتابوں میں مذکور ہیں، حضرت علی ابن ابی طالبؓ اس بارہ میں کہتے ہیں کہ آپکے کام ہمیشہ اعتدال کیساتھ ہوتا تھا نہ حق سے کمی کرتے نہ اس سے تجاوز کرتے، وہ کہتے ہیں کہ جب دو کاموں میں آپکو انتخاب کرنا ہوتا تو ہمیشہ آسان والا پہلو اختیار فرماتے (شمائل ترمذی) [۲] سورہ انعام ۱۶۲ [۳] سورہ توبہ ۳۶ [۴] سورہ روم ۴۳

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْہُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمْ اَجْرًا حَسَنًا مَّاکِثِیْنَ فِیْہِ اَبَدًا۔[1]

ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے بندے پر الکتاب اتاری (یعنی قرآن اتارا) اور اس میں کسی طرح کی بھی کجی نہ رکھی بالکل سیدھی بات! (ہر طرح کے پیچ وخم سے پاک!) اور اس لئے اتاری کہ لوگوں کو خبردار کردے، اللہ کی طرف سے سخت ہولناکی (ان پر) آسکتی ہے اور مومنوں کو جو اچھے کام کرتے ہیں خوشخبری دیدے کہ یقیناً ان کے لئے بڑی ہی خوبی کا اجر ہے، ہمیشہ اس میں خوشحال رہیں گے۔

ایک موقع پر ہے:۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً فِیْہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ[2]

ایک اللہ کا رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنادے جس میں درست مضامین لکھے ہوں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ لَّعَلَّہُمْ یَتَّقُوْنَ ۝[3]

جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ عربی قرآن ہے جس میں ذرا کجی نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اعتدال وحق پرستی کی اسپرٹ اس دین میں پوری طرح جاری وساری اور اس کے رگ وریشہ میں پیوست ہے، اس کے تمام قوانین، احکام، تعلیمات اور اس کا کلچر اور ثقافت سب اس کے زیر اثر اور زیر سایہ ہے،

---

[1] سورہ کہف ۱-۲ [2] سورہ بینہ ۲-۳ [3] سورہ زمر ۲۸

اس کے برعکس مادی تہذیب (جو یورپ میں مذاہب واخلاق سے عین بغاوت کے موقع پر وجود میں آئی) اول روز سے توازن سے محروم ہے، اس کے نظام اجتماعی میں انتہا پسندی، فکر وفلسفہ میں کج روی، علوم وآداب میں مبالغہ آرائی اور طوالت، ہر فعل اور ہر اقدام میں مشکل اور طویل راستہ اختیار کرنے کی خواہش اور عادت پوری طرح جلوہ گر ہے، اس طرح کی تہذیب میں اگر طبائع سلامتی واعتدال سے، عقل حق وصداقت کی راہ سے، اور زندگی سہولت اور سادگی سے، اور قومیں وحدت والفت سے محروم وناآشنا رہتی ہیں، تو جائے تعجب نہیں۔

دو باغ والے کا قصہ

اب قرآن مجید دو باغ والے کا قصہ بیان کرتا ہے یہ وہ قصہ ہے جس سے ہم کو روزمرہ کی زندگی میں پہلے قصہ سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے، اگر اصحاب کہف کا قصہ صدیوں اور برسوں میں پیش آتا ہے تو یہ قصہ تقریباً ہر جگہ اور ہر وقت ہمارے سامنے آتا ہے، اور بار بار دہرایا جاتا ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جو ہر اعتبار سے خوش نصیب واقبال مند تھا، آسائش وخوشحالی کے سارے سامان اس کے لئے مہیا تھے، اس کے پاس انگور جیسے لطیف ومرغوب پھل کے دو باغ تھے، ان کے چاروں طرف کھجور کے دلنواز درخت تھے جنھوں نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا، درمیان درمیان میں کاشت کے قطعے بھی تھے، یہ ایک متوسط درجہ کی زندگی کے لئے سعادت ومسرت کی آخری منزل تھی، اور متوسط طبقہ اور درمیانی معیارِ زندگی ہی اکثر دنیاوی معاملات میں معیار وپیمانہ ہے،

لیکن اس دولت منداور خوشحال شخص کی سعادت وکامیابی کا سارا انحصار محض ان باغات کے وجود تک محدود نہ تھا، بلکہ سارے اسباب ووسائل اس کے لئے مسخر تھے، اور یہ دونوں باغ اپنی بہترین پیداوار دے رہے تھے۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا۔[۵۱]	پس ایسا ہوا کہ دونوں باغ پھلوں سے لد گئے پیداوار میں کسی طرح کی بھی کمی نہ ہوئی ہم نے ان کے درمیان (آب پاشی کے لئے) ایک نہر جاری کر دی تھی۔

غرض اس طرح سعادت وکامرانی کی پوری تکمیل ہو چکی تھی اور آرام وراحت کے سارے اسباب نہ صرف موجود بلکہ ارزاں وفراواں تھے۔

مادی نظریات اور ان کی کوتاہ نظری

اس موقع پر اس شخص کے اندر وہ مادی مزاج اپنا رنگ دکھاتا ہے، جو ہمیشہ اہلِ حکومت، جاگیرداروں، قومی لیڈروں، صنعت کاروں، کارخانہ داروں اور فوجی طاقت رکھنے والوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے، اس کے اندر وہ شدید مادی رجحان پیدا ہوتا ہے، جو ایمان، معرفت صحیحہ، اور تربیت کا پابند نہیں، وہ اپنی ساری خوشحالی اور خوش بختی کو اپنے علم ولیاقت اور اپنی ذہانت ومحنت کی طرف منسوب کرتا ہے، جس طرح اس سے پہلے قارون نے کیا تھا اور کہا تھا:۔

---

[۵۱] سورہ کہف ۔ ۳۳

إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي[1] — یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔

وہ اپنے اس دوست پر فخر کرتا ہے جس کو یہ مرادیں حاصل نہ تھیں اور بڑی صراحت بلکہ ناروا جسارت سے کہتا ہے:۔

أَنَا أَكْثَرُ مِنكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا[2] — دیکھو میں تم سے زیادہ مالدار ہوں اور میرا جتھا بھی بڑا طاقتور جتھا ہے۔

وہ اپنے اقتدار و قوت کے سرچشمہ میں اور دولت و خوشحالی کے اس مرکز میں اس طرح داخل ہوتا ہے کہ نہ اس کو اپنی خبر ہوتی ہے نہ اپنے رب کی، نہ غیبی اسباب اور ارادۂ الٰہی کی جو سات آسمان سے اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے اور انسان اور اسکی ملکیت بلکہ انسان اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، وہ اپنے نفس پر علمی و عملی، اخلاقی اور عقلی ہر لحاظ سے ظلم کرتا ہے، یہ کور چشم مادی ذہنیت اس کی زبان سے اعلان کرواتی ہے کہ اب نہ اس کو زوال ہے، نہ اسکے باغات کو، وہ حشر و نشر کا انکار کرتا ہے اور بڑے پھوہڑ پن اور غایت درجہ حماقت کیساتھ یہ کہتا ہے کہ یہ کامیابی و خوشحالی ابدی ولافانی ہے، اور دنیا و آخرت (اگر آخرت ہو) کسی جگہ ختم ہونے والی نہیں:۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَدًا ۝ وَمَا أَظُنُّ — پھر وہ (یہ باتیں کرتے ہوئے) اپنے باغ میں گیا، اور وہ اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر رہا تھا، اس نے کہا: میں نہیں سمجھتا کہ

---

[1] سورہ قصص ۷۸ [2] سورہ کہف ۳۴

السَّاعَةَ قَآئِمَةً [۱] ایسا شاداب باغ کبھی ویران ہوسکتا ہے، مجھے توقع نہیں کہ (قیامت کی) گھڑی برپا ہو

وہ سمجھتا ہے کہ اس کا شماران معدودے چند خوش نصیب وکامران افراد انسانی میں ہے، جن سے اقبال کبھی منہ نہیں موڑتا اور قسمت کبھی بے وفائی نہیں کرتی اور جو ہمیشہ اور ہر جگہ سعادت اور عزت کے بام عروج پر نظر آتے ہیں۔

وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا [۲] اور اگر ایسا ہوا بھی کہ میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا گیا تو (میرے لئے کھٹکا ہے؟) مجھے ضرور (وہاں بھی) اس سے بہتر ٹھکانہ ملے گا۔

اس طرح کے لوگ ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایمان، عمل صالح، اور محنت و کاوش کی کیا ضرورت ہے، یہ ان کی فطری اور وہبی سعادت ہے جو ہر وقت انکو شادکام وبامراد رکھ سکتی ہے۔

ایمانی طرز فکر

اس کے دوست کی چشم بصیرت اللہ تعالیٰ نے حق وایمان کے لئے کھولدی تھی، اس کو معرفت الٰہی اور اس کے صفات وافعال کے علم کی لازوال دولت حاصل تھی، وہ جانتا تھا کہ صرف وہی اس کائنات میں تصرف کرنے والا ہے، اور اسباب کا خالق ہے اور جب چاہے، حالات کو پلٹ سکتا ہے، اس نے اس کی

---

[۱] سورہ کہف ۳۵-۳۶ [۲] ایضاً ۳۶

اس بات پر اعتراض کیا اور اس کے اس مادہ پرستانہ طرز فکر کی کھل کر مخالفت کی، اس کو اصل وحقیقت اور آغاز سے آگاہ کیا، یہ وہ سخت اور سنگین حقیقت ہے، جس کو یہ ظاہر پرست اور اپنے کو خوش نصیب سمجھنے والے ہمیشہ فراموش کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے تذکرہ سے دور بھاگتے ہیں :۔

قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا ۝[1]

یہ سن کر اس کے دوست نے کہا، اور باہم گفتگو کا سلسلہ جاری تھا، کیا تم اس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے تمہیں پہلے مٹی سے اور پھر نطفہ سے پیدا کیا، اور پھر آدمی بنا کر نمودار کر دیا؟

متکبر و مغرور اشخاص کے لئے اس بات کا سننا کتنا شاق و ناگوار ہے، اس کا اندازہ ہم کر سکتے ہیں، اس نے کہا کہ وہ اس کے بالکل دوسرے رخ پر ہے، اور دوسرے رجحان کا حامل ہے، اور وہ ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان :۔

لَّٰكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ۝[2]

لیکن میں تو یقین رکھتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار ہے، اور میں اپنے پروردگار کیساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔

پھر اس نے اس کو وہ بنیادی اور اصولی حقیقت یاد دلائی جس کے گرد پوری سورہ کہف گردش کر رہی ہے، اور اس جگہ انگلی رکھی جو اس طرح کے لوگوں کی کمزوری یا دکھتی رگ ہوتی ہے، اس نے کہا کہ دیکھنے کی چیز اسباب ظاہری

---

[1] سورہ کہف ۳۷ [2] ایضاً ۳۸

نہیں بلکہ وہ خالق و مالک ہے، جس کے ہاتھ میں ان سارے اسباب و وسائل کی ڈور ہے، اور یہ سامانِ راحت اور اسباب عیش جن پر وہ خوش اور نازاں ہے، نہ اسباب کی کارگزاری ہے، اور نہ خود اس کی دست کاری یا عقل و ذہانت کی کارفرمائی، وہ اللہ تعالے کی حکمت و قدرت کا نتیجہ ہے، جس نے ہر چیز کو بہترین طریقہ پر بنایا ہے، وہ بڑی حکمت اور نرمی کے ساتھ اس کو خدا کی قدرت کے اعتراف اور اس کی نعمت کے شکر کی طرف متوجہ کرتا ہے :-

وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ[1]

اور پھر جب تم اپنے باغ میں آئے (اور اس کی شادابیاں دیکھیں) تو کیوں تم نے یہ نہ کہا کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے، اس کی مدد کے بغیر کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔

سورہ کی روح اور قصہ کی کلید

"مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" دراصل اس سورہ کی روح اور سارے قصہ کی جان ہے، چنانچہ اللہ تعالے نے اپنے نبی کو اور آپ کے ساتھ قرآن مجید کے پڑھنے والے کو اس کی ترغیب دی ہے کہ وہ اپنا سارا معاملہ اور ساری طاقت و صلاحیت کو اللہ تعالے کے حوالہ کردے اور مستقبل کے ہر ارادہ اور نیت کو اس کے سپرد اور اس کی مشیت کے ساتھ مشروط اور وابستہ رکھے :-

---

[1] سورہ کہف ۳۹

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ۝ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ وَاذْكُرْ رَبَّكَ إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَنْ يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا ۝[1]

اور کوئی بات ہو، مگر کبھی ایسا نہ کہو" میں کل اسے ضرور کر کے رہوں گا" الا یہ کہ سمجھ لو، ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا، اور جب کبھی بھول جاؤ تو اپنے پروردگار کی یاد تازہ کرلو، تم کہو "امید ہے، میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا"

اور ہر موقع پر دل سے ماشاءاللہ اور انشاءاللہ کہتا ہو۔

جو شخص ہر فضل و کمال کو اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب کرتا ہو اور ہر نیت میں اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کرتا ہو اور اس کے فضل و کرم کا امیدوار ہو وہ اسباب ظاہری، مادیت، اور مادہ پرستوں کے سامنے اپنا سر کیسے جھکا سکتا ہے، اور نفس اور نفسانی ارادہ کے ہاتھ میں اپنی زمام کار کیسے دے سکتا ہے؟

"ماشاءاللہ" اور "انشاءاللہ" بظاہر دو بڑے ہلکے پھلکے لفظ ہیں اور اکثر ان کا استعمال بغیر سوچے سمجھے کیا جاتا ہے اور اس کے پیچھے کوئی احساس و شعور نہیں ہوتا، لیکن درحقیقت یہ دونوں بڑے وزنی، بڑے گہرے اور معانی و حقائق سے لبریز بول ہیں، اور اندھی مادیت، نفس، اور ارادۂ انسانی پر بھروسہ و اعتماد پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔

---

[1] سورہ کہف ۲۳-۲۴

مادی تہذیب کا اپنے وسائل واسباب پر اعتماد

مادی تہذیب اپنے وسائل اور ذرائع قوت پر حد سے بڑھے ہوئے اعتماد میں ممتاز ہے، یہ مادی حکومتیں اپنے ان عمرانی واقتصادی منصوبوں[۱] کا برابر اعلان کرتی رہتی ہیں، جو قدرت کی ہم آہنگی اور موسموں کے تغیرات سے تعلق رکھتی ہیں، وہ بڑی قطعیت کے ساتھ اس کی مدت اور اس کا حجم متعین کرتی ہیں، اور یہ طے کرتی ہیں، کہ وہ اتنے سال کے اندر اتنی پیداوار ضرور پیدا کرنے لگیں گی اور ان کے ملک خود کفیل ہو جائیں گے، اور بیرونی امداد پر ان کا انحصار ختم ہوجائیگا لیکن ارادۂ الٰہی ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہے، کبھی قحط سے واسطہ پڑتا ہے، کبھی سیلابوں سے، کبھی بارش بہت تاخیر سے ہوتی ہے، کبھی اس قدر مسلسل کہ کھڑی کھیتیاں غرقاب ہو جاتی ہیں، ایسے قدرتی حوادث اور جان ومال کے مصائب سامنے آتے ہیں، جو حاشیۂ خیال میں نہ آسکتے تھے، غرض کہ ان کے سارے اندازے غلط اور منصوبے ناکام ہوجاتے ہیں۔

---

[۱] ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ منصوبے بنائے ہی نہ جائیں اور علم کی بنیادوں پر اضافۂ پیداوار کی کوئی کوشش نہ کی جائے بلکہ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ طاقت کے یہ مظاہر اور معلومات کی کثرت ہمارے اندر سرکشی نہ پیدا کردے اور اسکے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال ہمارے ذہنوں سے نکل نہ جائے جو ان اسباب ومسببات سب کا خالق ہے۔

ارادۂ الٰہی پر ایمان واعتماد

یہ "انشاء اللہ" دراصل ہماری انفرادی زندگی کے چھوٹے اور حقیر کاموں سرسری ملاقاتوں اور سفروں یا محض تاریخ کے تعین کے لئے نہیں ہے، بلکہ یہ ان تمام اجتماعی کاموں اور عظیم منصوبوں پر حاوی ہے، جو پوری قوم کی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں، اس لئے ان سب چیزوں کو (بشمول جدوجہد، اسباب و وسائل کی اہمیت اور قرآن وسنت، اسوۂ نبوی اور عمل صحابہ کی روشنی میں تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت کے) اس یقین کے ماتحت ہونا چاہیئے کہ فیصلہ کن، بالاتر اور اول و آخر چیز بہر صورت ارادۂ الٰہی ہے، اس آیت میں،

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ[1]	اور کوئی بات ہو، مگر کبھی ایسا نہ کہو میں کل اسے ضرور کر کے رہوں گا، الّا یہ کہ سمجھ لو ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا"

صرف ایک فرد مخاطب نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ کا معاشرہ، تمام حکومتیں، ادارے اور جماعتیں اور تحریکیں مخاطب ہیں، اور ان سب سے اس کے اہتمام والتزام کا مطالبہ ہے، یہ ہر اس اسلامی معاشرہ کی روح ہے جس میں ایمان اچھی طرح سرایت کر چکا ہو اور اس تہذیب کی روح اور جوہر حیات ہے، جو ایمان بالغیب کی بنیاد پر قائم ہو اور یہی وہ خط فاصل ہے جو مادی تمدن اور ایمانی تمدن کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔

---

[1] سورہ کہف ۲۳-۲۴

یہ صاحب ایمان ساتھی اس کو متنبہ کرتا ہے کہ قسمتوں کا الٹ پھیر اور خوش نصیبی و بدنصیبی کی یہ تقسیم ابدی اور ناقابل شکست نہیں، زمام کار اور تصرف واقتدار کا اختیار خالق کائنات کے ہاتھ سے چھوٹ نہیں چکا وہ اب بھی اس کا مالک ہے، خوش نصیب بد قسمت ہو جاتا ہے، اور بد قسمت خوش نصیب، مالدار غریب بھی ہو سکتا ہے، اور غریب مالدار بھی، اس لئے اگر حالات پلٹ جائیں تو اس میں تعجب نہ ہونا چاہیے۔

اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا	اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کم تر
فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ	پا رہا ہے تو بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تیری
جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ	جنت سے بہتر عطا فرما دے، اور تیری
السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا اَوْ	جنت پر آسمان سے کوئی آفت بھیجدے،
يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ	جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے
لَهٗ طَلَبًا[۱]	یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے اور پھر
	تو اسے کسی طرح نہ نکال سکے۔

اور آخر کار یہی ہوا، خدا کی بھیجی ہوئی ایک آندھی آئی اور دیکھتے دیکھتے یہ لہلہاتا ہوا گلزار چٹیل میدان بن گیا۔

اب اس مست و بے خود شخص کو ہوش آیا:۔

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ	اور پھر (دیکھو) ایسا ہی ہوا کہ اس کی دولت
كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ	(بربادی کے) گھیرے میں آگئی، وہ ہاتھ

---

[۱] سورہ کہف۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱

خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّىْٓ اَحَدًا ۝ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ۝[1]

مل مل کر افسوس کرنے لگا، کہ ان باغوں کی درستگی پر میں نے کیا کچھ خرچ کیا تھا، (وہ سب برباد ہوگیا) اور باغوں کا یہ حال ہوا کہ ٹٹیاں گر کے زمین کے برابر ہوگئیں، اب وہ کہتا ہے، اے کاش، میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا، اور دیکھو کوئی جتھا نہ ہوا کہ اللہ کے سوا اسکی مدد کرتا اور نہ خود اس نے یہ طاقت پائی کہ بربادی سے جیت سکتا! یہاں سے معلوم ہوگیا کہ فی الحقیقت سارا اختیار اللہ ہی کے لئے ہے وہی ہے جو بہتر ثواب دینے والا ہے، اور اسی کے ہاتھ بہتر انجام ہے۔

دو باغ والے کا شرک

یہ باغ والا اس طرح کا مشرک نہیں تھا جس طرح عام مشرکین ہوتے ہیں، قرآن کے کسی نص یا اشارہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا، اس کے برعکس قرآن کے اسلوب اور انداز کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالے پر ایمان رکھتا تھا۔

---

[1] سورہ کہف ۴۲-۴۳-۴۴

وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا[۱] — اور اگر ایسا ہوا بھی کہ میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا گیا تو (میرے لئے کیا کھٹکا ہے؟) مجھے ضرور (وہاں بھی) اس سے بہتر ٹھکانہ ملے گا۔

پھر اس کا وہ شرک کیا تھا جس پر اس نے کفِ افسوس ملا اور ندامت کا اظہار کیا۔

يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا[۲] — اے کاش! میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا۔

وہ ظاہری بات جس میں اشکال کی کوئی وجہ نہیں یہ ہے کہ اس نے اسباب میں شرک اختیار کیا تھا، اور یہ سمجھتا تھا کہ اس کی ساری خوشحالی و دولت کا سرچشمہ یہی اسباب ظاہری ہیں، اور یہ انھیں کا ثمرہ اور احسان ہے، اس لئے اللہ تعالےٰ کو فراموش کر دیا اور اس کے تصرف اور تاثیر کا منکر ہو گیا۔

عہدِ حاضر کا شرک

یہی وہ شرک ہے جس میں موجودہ مادی تہذیب مبتلا ہے، اس نے طبعی، مادی اور فنی اسباب اور ماہرینِ فن (SPECIALISTS) کو خدا کا درجہ دے رکھا ہے، عہدِ حاضر کے انسان نے اپنی پوری زندگی ان کے رحم و کرم پر

---

۱ سورہ کہف ۳۶ ۲ ایضاً ۴۲

چھوڑدی ہے، وہ سمجھتا ہے کہ زندگی اور موت، کامیابی و ناکامی، اقبال و ادبار، خوش نصیبی و بدنصیبی سب ان کے ہاتھ میں ہے، اسباب مادی، کائناتی قوتوں اور نیچر کی یہ پرستش و تقدیس اور اہل اختصاص اور ماہرین فن پر اعتماد کلی اور ان کو خدا کے درجہ پر رکھنا ایک نئی وثنیت اور نیا شرک ہے، اس نے قدیم بت پرستی کے ذخیرہ میں جس کا ترکہ اس کے پاس اب بھی محفوظ ہے اور جس کے ماننے والے اور چاہنے والے اب بھی بکثرت موجود ہیں، ایک نئی قسم کی بت پرستی کا اضافہ کیا ہے، جو ایمان اور عبدیت کی حریف ہے، اور یہ وہی وثنیت ہے، جس کو سورہ کہف نے چیلنج کیا ہے، اور جس سے وہ پوری طرح برسرپیکار ہے۔

قرآن مجید اس دنیا کی زندگی کو اس کھیتی سے تعبیر کرتا ہے جو جلد ہی مٹنے والی اور خاک میں مل جانے والی ہے:۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝[1]

اور (اے پیغمبر!) انھیں دنیا کی زندگی کی مثال سنا دو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے (زمین کی روئیدگی کا معاملہ) آسمان سے ہم نے پانی برسایا، اور زمین کی روئیدگی اس سے مل جل کر ابھر آئی، (اور خوب پھلی پھولی) پھر (کیا ہوا؟ یہ کہ) سب کچھ سوکھ کر چورا چورا ہو گیا ہوا کے جھونکے اسے اڑا کر

---

[1] سورہ کہف ۴۵

منتشر کر رہے ہیں! اور کونسی بات ہے جس کے کرنے پر اللہ قادر نہیں؟

قرآن مجید نے دوسری جگہوں پر بھی اس مختصر اور فانی زندگی کی یہی تصویر کھینچی ہے سورہ یونس میں ہے:-

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ ۚ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝ [1]

دنیا کی زندگی کی مثال تو بس ایسی ہے، جیسے یہ معاملہ کہ آسمان سے ہم نے پانی برسایا اور زمین کی نباتات جو انسانوں اور چارپایوں کے لئے غذا کا کام دیتی ہیں، اس سے شاداب ہو کر پھلی پھولیں، اور باہمدگر مل گئیں پھر جب وہ وقت آیا کہ زمین نے اپنے (سبزی اور لالی کے) سارے زیور پہن لئے، اور لہلہاتے کھیتوں اور گراں بار باغوں سے) خوشنما ہو گئیں، اور زمین کے مالک سمجھے اب فصل ہمارے قبضہ میں آگئیں، تو اچانک ہمارا حکم دن کے وقت یا رات کے وقت نمودار ہو گیا اور ہم نے زمین کی ساری فصل اس طرح بیخ و بن سے کاٹ کے رکھ دی، گویا ایک دن پہلے تک اس کا نام و نشان ہی

---

[1] سورہ یونس ۲۴

نہ تھا، اس طرح ہم (حقیقت کی) دلیلیں
کھول کھول کر بیان کر دیتے ہیں ان لوگوں
کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔

قرآن کی نظر میں اس زندگی کی، جس کی ابدیت پر یہ مادہ پرست ایمان لائے ہیں، اور جس کو منفعت پرستوں اور لذت پسندوں (EPICUREANS) نے اپنا مرکز اور معبد بنایا ہے، صرف اتنی ہی حقیقت ہے، جو اوپر بیان کی گئی ہے، وہ ان پیمانوں اور پیمائشوں کو غلط و بے بنیاد قرار دے کر (جن پر ان تنگ نظر ظاہر پرستوں اور اسباب کے گرفتاروں نے پورا اعتماد کر رکھا ہے اور اس سے بڑی بڑی توقعات اور آرزوئیں قائم کر لی ہیں) ایمانی پیمانوں کو قابل ترجیح اور معیار صحیح قرار دیتا ہے:۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا [۱]

مال و دولت اور آل اولاد دنیوی زندگی کی دلفریبیاں ہیں (مگر چند روزہ، ناپائیدار) اور جو نیکیاں باقی رہنے والی ہیں تو وہی تمہارے پروردگار کے نزدیک باعتبار ثواب کے بہتر ہیں اور وہی ہیں جنکے نتائج سے بہتر امید رکھی جاسکتی ہے

دنیا کی زندگی قرآن کی روشنی میں

یہاں ایک لمحہ توقف کر کے ہمیں سوچنا چاہئے کہ دنیا کی زندگی کو

[۱] سورہ کہف ۴۶

قرآن مجید کس نگاہ سے دیکھتا ہے، مناسب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں صرف قرآن ہی سے رجوع کیا جائے اس لئے کہ اس بارہ میں مسلمانوں کے افکار میں بڑا اضطراب و پریشاں نظری ملتی ہے، اور اہل فکر کے رجحانات اس زندگی کی اصل قدر و قیمت کے بارہ میں مختلف ہیں۔

قرآن مجید بڑی وضاحت، طاقت، اور صراحت کے ساتھ اس زندگی کے اختصار و بے ثباتی اور آخرت کے مقابلہ میں اس کی بے وقعتی کا اظہار اور اعلان کرتا ہے۔

ایک جگہ آتا ہے:۔

فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ[1]

دنیا کی زندگی کی متاع تو آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے، مگر بہت تھوڑی۔

ایک اور جگہ:۔

اِعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ۖ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا ۖ وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۚ وَمَا

تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلہ میں) دنیوی حیات محض لہو و لعب اور (ایک ظاہری) زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال اور اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے جیسے مینہ (برستا) ہے کہ اس کی پیداوار (کھیتی) کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے

---

[1] سورہ براءت - ۳۸

الحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ[1] پھر وہ خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت (کی کیفیت یہ ہے کہ اس) میں عذاب شدید ہے، اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے اور دنیوی زندگی محض دھوکے کا اسباب ہے۔

وہ بڑی قوت اور صفائی کے ساتھ اس کو آخرت کا صرف ایک پل اور عمل کا ایک موقع قرار دیتا ہے،۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا[2]

روئے زمین میں جو کچھ بھی ہے ہم نے زمین کی خوشنمائی کا موجب بنایا ہے، اور اس لئے بنایا ہے کہ لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں، کون ایسا ہے جس کے کام سب سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے،۔

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ[3]

جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا، تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے،

---

[1] سورہ حدید ۲۰ [2] سورہ کہف ۷ [3] سورہ ملک ۲

وہ آخرت کو دائمی اور ابدی قرار دیتا ہے:۔

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝[۱]

اور دنیا کی زندگانی تو کچھ نہیں ہے مگر (ایک طرح کا) کھیل اور تماشہ، اور جو متقی ہیں، تو یقیناً ان کے لئے آخرت ہی کا گھر بہتر ہے، (افسوس تم پر!) کیا تم (اتنی بات بھی) نہیں سمجھتے؟

دوسری جگہ یہ ارشاد ہے:۔

وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى ۚ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝[۲]

تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے، وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے، کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے

وہ ان لوگوں کی سخت مذمت کرتا ہے جو اس فانی، عارضی، اور سقیم و ناقص دنیا کو اس آخرت پر ترجیح دیتے ہیں، جو ابدی و لازوال ہے، بے حد و بے کراں ہے، ہر کدورت سے پاک اور ہر اندیشہ سے محفوظ و بالاتر ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُوْنَ ۝ أُولٰئِكَ

جو لوگ (مرنے کے بعد) ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے صرف دنیا کی زندگی ہی میں مگن ہیں، اور اس حالت پر مطمئن ہوگئے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں

---

[۱] سورہ انعام ۳۲ [۲] سورہ قصص ۶۰

مَاوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝[۱]

تو ایسے ہی لوگ ہیں جن کا (آخری) ٹھکانہ دوزخ ہوگا، بہ سبب اس کمائی کے جو (خود اپنے عملوں ہی کے ذریعہ) کماتے رہتے ہیں۔

دوسری جگہ کہتا ہے:۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝[۲]

جو کوئی (صرف) دنیا کی زندگی اور اس کی دلفریبیاں ہی چاہتا ہے تو (ہمارا ٹھہرایا ہوا قانون یہ ہے کہ) اس کی کوشش و عمل کے نتائج یہاں پورے دیدیتے ہیں، ایسا نہیں ہوتا کہ دنیا میں اس کے ساتھ کمی کی جائے، لیکن (یاد رکھو) یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت (کی زندگی) میں (دوزخ کی) آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا، جو کچھ انھوں نے یہاں بنایا ہے، سب اکارت جائے گا، اور جو کچھ کرتے رہے ہیں سب نابود ہونے والا ہے!

ایک اور موقع پر آتا ہے:۔

وَوَيْلٌ لِّلْكَافِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ

اور عذاب سخت کی خرابی ہے ان منکروں کے لئے جنھوں نے آخرت چھوڑ کر دنیا کی

---

[۱] سورہ یونس ۷-۸ [۲] سورہ ہود ۱۵-۱۶

الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ[۱]

زندگی پسند کرلی، جو اللہ کی راہ سے انسانوں کو روکتے ہیں، اور چاہتے ہیں، اس میں کجی ڈالیں، یہی لوگ ہیں کہ بڑی گہری گمراہی میں جا پڑے۔

دوسری جگہ ہے:۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ[۲]

لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں، اور آخرت سے خود ہی غافل ہیں

ایک اور جگہ ہے:۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا، ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ، اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى[۳]۔

تو آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے اور بجز دنیوی زندگی کے اس کو کوئی (اخروی مطلب) مقصود نہ ہو، ان لوگوں کی فہم کی رسائی کی حد بس یہی (دنیوی زندگی) ہے تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کے رستے سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی اس کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ راست پر ہے

ایک اور جگہ ہے:۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ

یہ لوگ دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے

---

[۱] سورہ ابراہیم ۲-۳ [۲] سورہ روم ۷ [۳] سورہ نجم ۲۹-۳۰

وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا[۱] — آگے (آنے والے) ایک بھاری دن کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔

ایک جگہ آتا ہے:۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى[۲]۔ — (اس روز یہ حالت ہوگی کہ) جس شخص نے (حق سے) سرکشی کی ہوگی اور (آخرت کا منکر ہوکر) دنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی، سو دوزخ (اس کا) ٹھکانا ہوگا۔

وہ ان لوگوں کی تعریف کرتا ہے، جو دنیا و آخرت کو باہم جمع کرتے ہیں، لیکن آخرت کو ترجیح دیتے ہوئے اور اس کی صحیح اہمیت اور قیمت پہچانتے ہوئے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا...... وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۞ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ[۳] — اور پھر (دیکھو) کچھ لوگ تو ایسے ہیں (جو صرف دنیا ہی کے پرستار ہوتے ہیں اور) جنکی صدائے حال یہ ہوتی ہے کہ "پروردگار! ہمیں جو کچھ دینا ہے، دنیا ہی میں دیدے" پس آخرت کی زندگی میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوتا، اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو (دنیا اور آخرت، دونوں کی فلاح چاہتے ہیں۔ (وہ) کہتے ہیں پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی

---

[۱] سورہ انسان ۲۷ [۲] سورہ نازعات ۳۷-۳۸-۳۹ [۳] سورہ بقرہ ۲۰۰-۲۰۱

دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے، اور
ہمیں عذاب آخرت سے بچالے۔

حضرت موسیٰؑ کی زبان سے ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ۔[1]

اور (خدایا!) اس دنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی لکھ دے، اور آخرت کی زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی کر، ہم تیری طرف لوٹ آئے۔

اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کی مدح کرتے ہوئے یہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔[2]

اسے دنیا میں بھی بہتری دی، اور بلاشبہ آخرت میں بھی اس کی جگہ صالح انسانوں میں ہوگی

آسمانی مذاہب اور مادی فلسفوں کا فرق

یہاں آسمانی مذاہب، نبوت کی تعلیمات یا نبوت کا مدرسۂ فکر (اگر یہ تعبیر غلط نہ ہو) مادی فلسفوں اور اس مادہ پرستانہ طرز فکر سے کلیۃً مختلف اور متصادم ہے جس کا اصرار ہے کہ یہی زندگی سب کچھ ہے اور جس کی عظمت و تقدیس فکر و اہتمام، انہماک و محویت، اور اس کو زیادہ سے زیادہ پر راحت اور پرکشش بنانا اس کا سب سے بڑا اور محبوب مقصد ہے۔

وہ نقطۂ نظر یا نفسیات جو قرآن دنیاوی زندگی کے بارہ میں پیدا کرنا چاہتا ہے

---

[1] سورہ اعراف ۱۵۶ [2] سورہ نحل، ۱۲۲

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک اقوال میں پوری طرح نمایاں اور جلوہ ریز ہے۔

آپ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے:۔

اللھم لاعیش الاعیش الاخرۃ[1]	اے اللہ زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

آپ کی دعا یہ تھی:۔

اللھم اجعل رزق آل محمد قوتاً	اے اللہ آل محمد کا رزق ضرورت بھر رکھ
وفی روایۃ کفافاً۔[2]	ایک روایت میں ہے کہ بس اتنا کہ کفایت کر جائے،

مستورد بن شدادؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:۔

واللہ ماالدنیا فی الاخرۃ الا مثل ما یجعل احدکم اصبعہ فی الیم فلینظر بم یرجع[3]	خدا کی قسم دنیا آخرت کے مقابلہ میں اتنی ہی ہے جیسے تم میں سے کوئی سمندر میں اپنی انگلی ڈالے پھر دیکھے کہ کتنا پانی اس میں آتا ہے۔

آپ کی پاک زندگی اسی عقیدہ اور نفسیات کا شفاف آئینہ یا عکس تھی۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک چٹائی پر آرام فرما تھے، اور چٹائی کا اثر آپ کے جسم مبارک پر ظاہر تھا، ابن مسعودؓ نے کہا یا رسول اللہ آپ حکم فرماتے تو کوئی چیز اس پر بچھا دی جاتی، اس پر آپ نے فرمایا: مجھے دنیا سے کیا کام! میری اور دنیا کی مثال تو بس اس سوار کی ہے

---

[1] صحیح بخاری (کتاب الرقاق) [2] صحیح مسلم (کتاب الزہد) [3] صحیح مسلم

جو کسی درخت کے سایہ میں تھوڑی دیر کے لئے دم لے لے پھر اس کو چھوڑ کر اپنی راہ لے[۱]"

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ حدیث ایلا میں فرماتے ہیں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، آپ ایک بٹی ہوئی چٹائی پر آرام فرما تھے، آپ کے اور چٹائی کے درمیان کوئی بچھونا نہ تھا، چٹائی کے نشیب و فراز اور چٹائی کا اثر آپ کے پہلو میں ظاہر تھا، آپ چمڑے کے ایک تکیہ پر جس میں گھاس بھرا ہوا تھا، ٹیک لگائے تھے، میں نے آپ کو سلام کیا (کچھ تفصیل کے بعد آگے کہتے ہیں) میں نے گھر پر ایک نظر ڈالی خدا کی قسم اس میں کوئی چیز ایسی نہ تھی کہ نگاہ کو متوجہ کرتی سوائے چمڑے کے تین ٹکڑوں کے، میں نے کہا یا رسول اللہ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو فراخی عطا فرمائے، ایرانیوں اور رومیوں کو تو خوب دنیا کی نعمتیں حاصل ہیں، حالانکہ وہ اللہ کی عبادت بھی نہیں کرتے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے، اور فرمایا، ابن خطاب! تم بھی ایسا سوچتے ہو؟ یہ تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی نعمتوں کا سارا حساب اسی دنیا میں چکا لیا ہے[۲]"

مدرسۂ نبوت کے طالب علم اور ان کا کردار

جو شخص اس مدرسۂ نبوت میں تربیت پاتا تھا وہ اس رنگ میں رنگ جاتا تھا اور آخرت کی فکر ہر وقت اس کے ذہن و دماغ پر چھائی رہتی تھی بلکہ اس کے

---

[۱] احمد، ترمذی، ابن ماجہ [۲] صحیح بخاری ج ۲ (کتاب النکاح)

جان و دل میں پیوست اور خون کے اندر شامل ہو جاتی تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ آخرت سے کسی وقت بھی غافل نہ ہوتا تھا، اور اس کے بدلہ میں کوئی اور چیز لینے پر تیار نہ تھا، مدرسۂ نبوت کے ان تلامذہ اور فضلاء کی اسپرٹ اور روح کو سمجھنے کے لئے جوان کے قلب و دماغ پر حاوی اور رگوں میں خون کی طرح جاری و ساری تھی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اوصاف و کیفیات کا مطالعہ کافی ہے، یہ اس انسانی نمونہ اور طرز کی بولتی ہوئی تصویر ہے جو مدرسۂ نبوت اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دامن شفقت اور آغوش رحمت میں پرورش پائی تھی۔

ابو صالح رضؓ سے روایت ہے، حضرت معاویہ بن ابو سفیان رضؓ نے حضرت ضرار بن ضمرہؓ سے یہ فرمائش کی کہ علیؓ کا کچھ حال بیان کرو، انھوں نے کہا کیا مجھے اس سے معاف رکھا جا سکتا ہے، انھوں نے کہا کہ نہیں ان کے کچھ اوصاف بیان کرو، انھوں نے کہا کہ کیا آپ مجھے معاف رکھیں گے، کہنے لگے نہیں، اس سے معافی نہیں ہے، انھوں نے کہا اچھا تو سنئے! خدا کی قسم وہ بہت بلند نگاہ اور قوی و توانا تھے، صاف اور واضح بات کہتے اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے، علم ان کے ہر پہلو سے چشمہ کی طرح ابلتا اور حکمت انکے ہر بُن مو سے گویا تھی، دنیا اور اس کی زینت سے متوحش اور رات اور اس کے اندھیرے سے مانوس، بخدا وہ بہت رونے والے اور بہت فکرمند تھے، اپنی ہتھیلی پلٹتے اور اپنے نفس کو خطاب کرتے، لباس ان کو وہ پسند تھا، جو موٹا ہو، کھانا وہ مرغوب تھا، جو بہت معمولی اور روکھا پھیکا ہو، ہمارے درمیان اس طرح

رہتے جیسے ہم میں سے ایک ہوں، ہم سوال کرتے تو فوراً جواب دیتے، ہم آتے تو سلام میں سبقت کرتے اور بڑھ کر استقبال کرتے، ہم بلاتے تو فوراً آجاتے لیکن ہم ان کو اس دلداری اور ان سے اس قرب و تعلق کے باوجود رعب کی وجہ سے ان سے ٹھیک سے بات بھی نہ کر سکتے تھے، ان کی عظمت کی وجہ سے ان پر سبقت نہ لے سکتے تھے، مسکراتے تو معلوم ہوتا کہ موتیوں کی کوئی آبدار لڑی ہے، اہلِ دین اور مساکین کی عزت کرتے، کسی طاقتور کو ان سے غلط فیصلہ کی توقع نہ تھی، اور کوئی کمزور ان کے انصاف سے مایوس نہ تھا، میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان کو بعض خاص اوقات میں اس طرح دیکھا ہے کہ رات اپنے سیاہ پردے ڈال چکی تھی، اور ستارے بھی ڈھل چکے تھے وہ اپنے مصلّی پر کھڑے تھے، اپنے ہاتھ سے اپنی داڑھی پکڑتے اور اس طرح تڑپتے اور بے چین ہوتے جیسے سانپ نے ان کو ڈس لیا ہو، ایک غمزدہ انسان کی طرح روتے، اس وقت بھی میرے کانوں میں ان کے یہ الفاظ گونج رہے ہیں، اے دنیا کیا تو میرا راستہ روکنا چاہتی ہے یا مجھے لبھانا چاہتی ہے، افسوس صد افسوس، یہ دھوکہ کسی اور کو دینا، میں نے تجھکو تین طلاقیں دی ہیں جس کے بعد رجعت کا کوئی سوال نہیں، تیری عمر بہت مختصر، زندگی بہت حقیر، اور تیرا خطرہ بہت بڑا ہے، آہ زادِ سفر کتنا کم ہے، سفر کتنا طویل ہے، راستہ کتنا وحشتناک ہے"[1]

اب آپ کے سامنے ایک دوسری مثال پیش کی جاتی ہے، یہ ایک

---

[1] صفوۃ الصفوۃ ابن جوزی

صحابیؓ کا خطبہ ہے جو ایک مشہور اسلامی شہر میں دیا گیا ہے۔

خالد بن عمیر العدوی سے روایت ہے کہ عتبہ بن غزوان نے (جو بصرہ کے امیر تھے) ہمیں خطبہ دیا، حمد و ثنا کے بعد انھوں نے کہا کہ "بیشک دنیا اپنے خاتمے کے قریب ہے، اور بہت تیزی کے ساتھ جگہ چھوڑتی جا رہی ہے اور اس کے جام میں اب صرف چند گھونٹ یا قطرے باقی رہ گئے ہیں، اور تم یہاں سے ایک ایسے گھر میں منتقل ہونے والے ہو جس کو کوئی زوال نہیں، پس کچھ خیر لے کر یہاں سے واپس جاؤ، اس لئے کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ایک پتھر جہنم کے کنارے سے پھینکا جائے گا تو ستر برس تک اس میں گرتا رہے گا، اور تہ تک نہ پہونچ پائے گا، اور خدا کی قسم وہ بھری جائے گی، کیا تم کو اس میں تعجب ہے؟ اور ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جنت کے دروازے کے دونوں چوکھٹ کے درمیان چالیس سال کی مسافت ہے، اور اس پر ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ آدمیوں سے کھچا کھچ بھری ہوگی، اور بیشک سات سات دن ہم پر اس حالت میں گزر جاتے تھے کہ درخت کے پتوں پر ہمارا گزر ہوتا جس کو کھاتے کھاتے منہ کے کنارے چھل جاتے، مجھے ایک چادر ملی تو میں نے اس کے دو ٹکڑے کئے ایک سعید بن مالک کو دیا، ایک میں نے اوڑھ لیا، آج ہم میں سے ہر ایک آدمی کسی بڑے شہر کا امیر و والی ہے، اور میں خدا سے اس کی پناہ چاہتا ہوں کہ میں اپنی نظر میں بڑا ہوں اور خدا کے نزدیک چھوٹا ہوں[1]"

---

[1] صحیح مسلم ج ۲۔ (کتاب الزہد)

جدید ذہنیت اور عقیدۂ آخرت کی کمزور ترجمانی

جو ذہنیتیں اور جو تحریکیں ایمان سے پوری طرح سیراب نہیں اور جن کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس درسگاہ کی تربیت و رہنمائی براہِ راست حاصل نہیں وہ اس فکر و عقیدہ یا اس ذوق و رجحان کو پوری طرح ہضم کرنے کے قابل نہیں ہوتیں اور اس سے ان کو زیادہ دلچسپی معلوم نہیں ہوتی، وہ برابر اسکے بارہ میں کشمکش میں رہتی ہیں یا اس کے تذکرہ میں ان کے اندر وہ گرم جوشی نہیں پائی جاتی جو مزاج نبوت سے مناسبت رکھنے والوں میں پائی جانی چاہیئے، وہ اس سے راہ فرار اختیار کرنا چاہتی ہیں، یا اس کی یہ تاویل کرتی ہیں، کہ اسطرح کی باتیں ایک خاص زمانہ اور ماحول کے لئے تھیں اور ان کے کچھ خاص اسباب تھے، لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قرآن مجید اور سیرت نبوی اس روح سے لبریز اور معمور ہے، اور یہی وہ صحیح اسلامی مزاج یا اسلامی نفسیات ہے، جو صرف مدرسۂ نبوت میں پیدا ہوتی ہے، چنانچہ جب بھی قرآن مجید اور سیرت نبوی کو کسی ماحول میں اپنا کام کرنے کا اور کسی ایسی نسل کی تیاری کا موقع ملتا ہے جو بیرونی اثرات سے محفوظ رہی ہو اور جس کی نشو ونما خالص اسلام میں ہوئی ہو تو اس کا خمیر، مزاج، ذہنیت یا نفسیات یہی ہوتی ہے، دنیا کی آرائش اور ضرورت سے زائد چیزوں سے پرہیز، قناعت، آخرت کی فکر اور ان کاموں سے دلچسپی جو اخروی زندگی میں نفع دے سکیں، خدا کے سامنے حاضری کا شوق جو کچھ اللہ تعالےٰ کے پاس ہے اس کو دنیا پر ترجیح دینا، ایمان پر خاتمہ اور

خدا کی راہ میں موت کا استقبال، یہ اہلِ ایمان کی وہ جماعت اور وہ انسانی نمونہ ہے، جس کی زبانوں پر اب بھی کبھی کبھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام اور سابقین اولین کا یہ جملہ بے ساختہ آجاتا ہے۔

غداً الاقی الاحبۃ محمداً وحزبہ[1] — کل دوستوں اور محبوبوں سے ملاقات ہوگی محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کی جماعت سے!

نبوت کی دعوت اور اصلاحی تحریکات کا فرق

بعض تحریکیں اور دعوتیں ایمان بالآخرت کی ترجمانی و تشریح بہت اچھی طرح کرتی ہیں، اور بہت تفصیل کے ساتھ اور دلنشین طریقہ پر اس کی حکمتوں فائدوں اور زندگی پر اس کے خوشگوار اثرات اور اخلاقی نظام میں اس کی اہمیت کا ذکر کرتی ہیں، لیکن ہر ذہین و سمجھدار شخص محسوس کرسکتا ہے کہ یہ آخرت کا صرف ایک اخلاقی ضرورت اور ذریعۂ اصلاح و تربیت کے طور پر استعمال ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر بہتر سوسائٹی اور صالح معاشرہ کا قیام مشکل ہے، یہ کوشش بعض وجوہ سے لائق تحسین ضرور ہے، لیکن وہ انبیاء کرام کے طریقۂ فکر اور طریقۂ عمل، ان کی سیرت و کردار، اور ان کے خلفاء و نائبین کے طریقۂ زندگی سے کھلے طور پر مختلف ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر (یعنی طریقۂ انبیاء) ایمان و وجدان، احساس و شعور اور ذوق و شوق کا نام ہے، وہ ایک ایسا عقیدہ ہے، جو انسان کے تمام احساسات و

---

[1] یہ سیدنا بلال بن رباح الحبشی کا جملہ ہے (احیاء العلوم روایت ابن ابی الدنیا)

جذبات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، آخر الذکر اس کو قانونی حیثیت سے تسلیم کرنے کی ظاہری شکل ہے، اول الذکر لوگ آخرت کا ذکر جب کرتے ہیں، بے ساختگی، لذت، اور لطف و کیفیت کے ساتھ کرتے ہیں، اور اس کی دعوت بڑی قوت، گرم جوشی، اور یقین کے ساتھ دیتے ہیں، دوسرا طرز رکھنے والے لوگ ایک اخلاقی و سماجی ضرورت کے بقدر اس کا ذکر کرتے ہیں، اور قومی اصلاح اور اخلاقی تنظیم کے جذبہ سے اس کی دعوت دیتے ہیں، جذبہ اور وجدان اور ذوق و کیفیت اور منطق اور اجتماعی مصالح میں جو عظیم فرق ہے، اس کی تشریح کی یہاں ضرورت نہیں۔

قوت کا سرچشمہ اور ہمت و پیشقدمی کا سب سے بڑا محرک

لیکن آخرت پر اس زبردست یقین، دنیا پر اس کی ترجیح و فوقیت اور تعیشات اور فضول سامان آرائش سے اس درجہ کنارہ کشی نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام کو دنیا کی قیادت اور انسانیت کی رہنمائی سے دستبردار ہونے اور زندگی کے دھارے سے علیحدہ رہنے پر آمادہ نہیں کیا، اس نے ان کے اندر یہ جذبہ پیدا نہیں کیا کہ وہ اسباب معیشت کو ترک کردیں اور حق و صداقت کے لئے جد و جہد سے دست کش ہو جائیں، ان کا ایمان کمزوری اور شکست خوردگی کا باعث نہ تھا (جیسا کہ آخری صدیوں میں ہم کو نظر آرہا ہے) بلکہ وہ قوت کا سرچشمہ اور ہمت و پیشقدمی اور بدی کے خلاف جد و جہد کا بہت بڑا محرک تھا، وہ جاں بازی، دلیری، قوت، اور فتح و ظفر کا وسیلہ اور

بڑا ذریعہ تھا، چنانچہ جو لوگ دنیا کے معاملہ میں سب سے زیادہ زاہد، آخرت کے سب سے زیادہ شائق، اس کے یقین میں سب سے زیادہ سرشار اور خدا تعالٰی کے دربار میں حاضری اور شہادت فی سبیل اللہ کے سب سے زیادہ مشتاق تھے، وہی سب سے زیادہ جاں نثار و جاں باز، بہادر و جگر دار تھے، اور حق کے لئے سرفروشی، جہاد و قربانی اور فتوحات اسلامی میں ان ہی کا سب سے بڑا حصہ تھا۔

یہ دراصل اس عقیدہ کی خاصیت ہے وہ قدرتی طور پر اپنے ماننے والوں میں اس زندگی کی بے وقعتی، خواہشات پر قابو اور مردانگی و حق پرستی کے یہ اوصاف پیدا کرتا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کی فتوحات و ترقیات اور اس کی عام ترویج و اشاعت اسی ایمان و عقیدہ کی مرہون منت ہے۔

ایمان بالآخرت اور رہبانیت میں کوئی رشتہ نہیں

اس لحاظ سے یہ عقیدہ (یعنی ایمان بالآخرت اور اس دنیا کی زندگی کے بارہ میں قرآنی نقطۂ نظر) اس مبغوض و ناپسندیدہ رہبانیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جس کی قرآن نے بہت مذمت کی ہے، اور جو عالم اسلام میں اسلامی تعلیمات کی کمزوری و بے اثری اور قرون اولیٰ سے بُعد، نیز عجمی رجحانات اور بیرونی فلسفوں مثلاً مسیحیت، بودھ مت، برہمنزم اور افلاطونیت جدیدہ کے اثر سے پیدا ہو گئی تھی۔

یہ عقیدہ دنیا کی حق تلفی اور اس کی صحیح قیمت سے انکار کے بغیر آخرت کی ترجیح پر قائم ہے، اس کی بنیاد آخرت کے لئے جدوجہد، حق و صداقت کیلئے سعی مسلسل، اور لازوال زندگی کے حصول کے لئے عارضی و فانی خواہشات کی قربانی اور رضائے الٰہی کی طلب ہے، اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ مسلمان صرف اس عقیدہ کی کمزوری کی وجہ سے کمزور ہوئے ہیں، مسلمانوں کی نئی نسل جو آج ہواوہوس میں گرفتار نظر آرہی ہے اس کو اس عقیدہ کی تجدید، اس کے ازسرنو احیاء اور مسلمانوں میں اس کی اشاعت کی شدید ضرورت ہے، کھسکی ہوئی چول اس وقت تک اپنی صحیح جگہ پر نہیں آئے گی اور مسلمانوں کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک وہ اس زندگی کو قرآن کی نگاہ سے دیکھنا شروع نہ کریں گے اور یہ وہ نقطہ ہے جس سے مادی طرز فکر کو سخت اختلاف ہے، جو لوگ مادی فلسفہ اور اس زندگی کی پرستش میں مبتلا ہیں، خواہشات کے مارے ہوئے اور نفس کے کچلے ہوئے ہیں، اور صرف دنیا کی خوشحالی و ترقی اور آرام وراحت کے طلبگار ہیں، اور اس کے سوا کچھ اور نہیں چاہتے، وہ اس نقطۂ نظر کو قبول کرنے یا اس کے ساتھ صلح کر لینے پر کسی صورت میں تیار نہیں ہو سکتے۔

سورہ کہف نے اسی مادہ پرستانہ طرز فکر کی تردید کی ہے اور اس مادی مذہب اور اس کے علمبرداروں پر ضرب لگائی ہے، اس نے اس زندگی کی صرف وہ تصویر پیش کی ہے جو صحیح اور مطابق حقیقت ہے، خواہ یہ بات کسی کو پسند ہو یا نہ ہو۔

حضرت موسیٰؑ و حضرت خضرؑ کا قصہ

اب ہم حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا وہ قصہ شروع کرتے ہیں جو اسی
زندگی اور اسی دنیا کا قصہ ہے جس میں ہم سب رہتے ہیں، اس سے بہت عملی طریقہ
پر اور بڑی واضح اور غیر معمولی شکل میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس دنیا کے
معلومات و مکشوفات سے ماوراء اور بہت سی نامعلوم چیزیں بھی ہیں، اور
جن چیزوں سے ایک انسان (خواہ وہ بہت بڑا عالم و باخبر ہو) ناواقف ہے
وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں، جو اس کے علم میں ہیں، وہ ہمیشہ اپنے مشاہدہ اور
احساس پر رائے قائم کرتا ہے، اور اسی لئے اس سے بار بار غلطیاں ہوتی ہیں
اور ٹھوکریں لگتی ہیں، اگر زندگی کے حقائق اس پر آشکارا ہو جائیں، اور رموز و
اسرار اور باطنی معاملات کا اسے علم ہو جائے تو اس کے نظریات بڑی حد تک
بدل جائیں گے، اور خود اس کو اپنے بہت سے فیصلوں سے ہٹنا پڑے گا
اس قصہ سے ہمیں اس کا ثبوت ملتا ہے، کہ اس کے رائے اور فیصلہ، سلک
و رجحان اور احساس و خیال کا کوئی بھروسہ نہیں، مزید یہ کہ اس کائنات کا
احاطہ ناممکن ہے اس لئے رائے قائم کرنے اور فیصلہ کرنے میں عجلت
اور اپنے احساسات و خیالات پر اصرار درست نہیں، یہ زندگی بڑی مبہم،
لپٹی ہوئی، اور تہ در تہ ہے، کائنات بڑی وسیع اور عظیم ہے، جگہ جگہ اس کا
باطن ظاہر سے مختلف اور آخر اول سے جدا ہے، اس زندگی میں اتنے بڑے
بڑے معمے، چیستان اور پیچیدہ سوالات ہیں، کہ انسان اپنی ساری ذہانت

علم، اور جستجو و آرزو کے باوجود ان کو ابھی تک حل نہیں کر سکا، اس میں بکثرت ایسی گرہیں اور گتھیاں ہیں، جن کی عقدہ کشائی سے علم انسانی اپنی ساری وسعت اور ترقی کے باوجود عاجز ہے، روزمرہ کی عام زندگی پر نظر ڈالئے تو وہ بھی فاش غلطیوں، عاجلانہ فیصلوں، جذباتی اور فوری اقدامات اور برجستہ اور سرسری افکار و خیالات سے آلودہ نظر آئے گی، اگر اس وسیع و عظیم کائنات کا انتظام علم انسانی کے حوالہ کر دیا جائے اور اس کو مکمل آزادی اور مکمل اختیار دیدیا جائے تو وہ پوری دنیا میں فساد برپا کرے گا، اور نسل اور زراعت دونوں کی ہلاکت و بربادی کا باعث ہوگا، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کی نگاہ قاصر اور عمل محدود ہے، جلد بازی اس کے خمیر میں داخل اور بے صبری اس کی سرشت میں پیوست ہے۔

اس عظیم اور اہم حقیقت کو ثابت و ظاہر کرنے کے لئے (جو تمام مذاہب اور ایمان بالغیب کی بنیاد ہے) اللہ تعالیٰ نے اپنے عہد کی اس سب سے بڑی شخصیت کا انتخاب فرمایا جس کو نہ صرف علم کا بلکہ خیر و صلاح کا بھی بہت بڑا حصہ ملا تھا، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں جن کا شمار اولوالعزم انبیاء میں ہے، وہ ایک موقع پر بنی اسرائیل کے سامنے تقریر کرنے کھڑے ہوئے، تو ان سے سوال کیا گیا کہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا کون ہے، تو انھوں نے جواب دیا، میں، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس جواب کو پسند نہیں فرمایا

اس لئے کہ انھوں نے علم کا انتساب خدا کے بجائے اپنی طرف کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی بھیجی کہ مجمع البحرین (دو سمندروں کے سنگم) میں ایک بندہ ہے جو تم سے زیادہ جاننے والا ہے۔[1]

عجیب و غریب حالات

اب ان کا سفر ایک ایسے آدمی کے ساتھ شروع ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخصوص رحمت سے نوازا تھا اور اپنا خاص علم عطا کیا تھا، ان کا علم و فہم حقیقت سے اور ان کی رائے (جس کی تائید ظاہر سے ہوتی تھی) امر واقعی سے تین موقعوں پر متصادم ہوتی ہے۔

حضرت خضر جس کی کشتی پر سوار ہوتے ہیں، اور جب پر اس کا مالک ان کو بلا معاوضہ کے سوار کرتا ہے اسی کو توڑ دیتے ہیں، حضرت موسیٰؑ اس سے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں، اور اپنے علم اور حال ظاہری کے مطابق اس کا سبب دریافت کرتے ہیں، حضرت خضر ایک معصوم لڑکے کو جس نے ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی، نہ اس کے والدین نے ان کے ساتھ کوئی برا معاملہ کیا، قتل کر دیتے ہیں، اسی طرح ایک گرتی ہوئی دیوار کی بلا اجرت مرمت کرتے ہیں، حالانکہ گاؤں والے ان کی میزبانی کے لئے بھی تیار نہ ہوئے تھے یہ حضرت خضر کے وہ عجیب و غریب معاملات اور نہ سمجھ میں آنے والی باتیں تھیں جو حضرت موسیٰؑ کے دل میں حد درجہ حیرت و استعجاب پیدا کر رہی تھیں اور ان کو بار بار سوال کرنے پر مجبور کرتی تھیں، جو کشتی ان کے سفر میں مددگار ثابت ہو رہی تھی،

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ (کتاب التفسیر)

اس کا حق یہ تھا کہ اس کی حفاظت کی جائے نہ کہ اس کو توڑا جائے، اسی طرح کشتی کے مالک نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، اس کا تقاضہ یہ تھا کہ اس کے اِس احسان کا اعتراف کیا جائے، اور اس کے ساتھ خیر خواہی کی جائے، اس معصوم لڑکے کا حق یہ تھا کہ اس کے ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ کیا جائے اور اس کی تربیت اور نگہداشت کی جائے، جس گاؤں والوں نے ان کے ساتھ اس قدر بے مروتی اور تنگ دلی کا ثبوت دیا تھا، ان کو کھانا پانی دینے کے بھی روادار نہ ہوئے ان کا حق یہ تھا کہ ان کے ساتھ اس ہمدردی کا معاملہ نہ کیا جائے، لیکن حضرت خضرؑ بظاہر ہر معقول بات اور ہر عرف و دستور کے خلاف نظر آتے ہیں، اور ان تینوں موقعوں پر ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جس کی تائید نہ عقل سے ہوتی ہے نہ منطق سے، نہ ذوق و وجدان سے، حضرت موسیٰؑ جو اللہ کے نبی اور ایک ایسے انسان تھے، جو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ غیور و حساس واقع ہوا تھا، اور کسی غلط کارروائی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، ان نا قابل فہم باتوں اور کارروائیوں کے سامنے خاموش نہیں رہ پائے، وہ اپنا وعدہ بھول کر اپنی مخالفت اور حیرت کا اظہار آخر کار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا۔ آپ نے کیسی برائی کی بات کی!

حقائق کتنے عجیب ہوتے ہیں

حضرت خضرؑ حضرت موسیٰؑ کے سوالات کو دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں، اور ان کا جواب دیئے بغیر بڑے صبر و سکون کے ساتھ اپنی کارروائی

میں مشغول رہتے ہیں، یہاں تک کہ یہ سفر اپنی منزل مقصود پر پہونچ کر تمام ہوتا ہے، اس وقت وہ ان رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں، جو ان واقعات کے اندر پوشیدہ تھے، اور حضرت موسیٰؑ کے لئے سخت حیران کن اور ناقابل فہم تھے، جو شخص ایک بار بھی قرآن مجید میں اس قصہ کو پڑھتا ہے اس پر یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت خضرؑ حق پر تھے، اور انھوں نے جو کچھ کیا درست کیا، انھوں نے ان تینوں مواقع پر بڑی حکمت و دانائی کا ثبوت دیا انھوں نے کسی اچھائی کی جگہ برائی اور برائی کی جگہ اچھائی نہیں کی، کشتی توڑ کر انھوں نے یہ احسان کیا کہ اس کو ضبطی سے بچا لیا، اس کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ وقت کشتیوں کی تلاش میں تھا، اور ہر صحیح سالم کشتی کو غصب کر رہا تھا، انھوں نے بلا معاوضہ سوار ہونے کا معاوضہ یہ دیا کہ اس کی کشتی بادشاہ کی ظالمانہ دستبرد سے بچالی۔

لڑکے کے والدین کے ساتھ ان کا احسان یہ تھا کہ یہ لڑکا ان کے لئے فتنہ بننے والا تھا اگر وہ زندہ رہتا تو ان کو سرکشی و کفر تک پہونچا دیتا، انھوں نے سوچا کہ گھڑی بھر کا رونا زندگی بھر کے رونے اور مرنے کے بعد رونے سے بہتر ہے، لڑکے کا بدل ممکن ہے، لیکن ایمان اور حسن خاتمہ کا بدل ممکن نہیں۔

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا۔[۱]	باقی رہا لڑکے کا معاملہ تو اس کے ماں باپ مومن ہیں، ہمیں یہ دیکھ کر ڈر لگا کہ انھیں سرکشی اور کفر کر کے اذیت پہونچائیگا، پس ہم نے چاہا کہ ان کا پروردگار اس لڑکے سے بہتر

۱۔ ایضاً ۸۰-۸۱

انھیں لڑکا دے، دینداری میں بھی اور
محبت کرنے میں بھی۔

شکستہ اور جھکی ہوئی دیوار اس لئے درست کی کہ وہ دو یتیم لڑکوں کی ملک میں تھی، اور اس کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا، اگر وہ گرجاتی تو خزانہ کا راز کھل جاتا، چور اچکے اس کو لوٹ لیتے اور یہ یتیم محروم رہ جاتے جو اس کے اصل مالک اور جائز وارث تھے، اس طرح یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ عمل کی پاکیزگی زندگی میں بھی نفع پہونچاتی ہے، اور مرنے کے بعد بھی، جب اللہ تعالےٰ ایک صالح مرد کی اولاد کو ضائع کرنا پسند نہیں کرتا تو خود مرد صالح کو کیوں ضائع کرے گا، اور بے یار و مددگار چھوڑ دے گا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ [۱] — اللہ نیک عملوں کا اجر کبھی نہیں ضایع کرتا!

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّي لَا اُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى [۲] — جواب میں ان کے رب نے فرمایا" میں تم میں سے کسی کا عمل ضایع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت۔

جو پاک بیج [illegible]لے جاتے ہیں، ان کا بھی نتیجہ ظاہر ہوتا ہے اور جو بُرے ہوتے ہیں، ان کا بھی۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ — "اور وہ جو دیوار درست کردی گئی، تو (اس کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے وہ) شہر کے دو یتیم لڑکوں

---

[۱] سورہ یوسف ۹۰ [۲] سورہ آل عمران ۱۹۵

أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا۔[1]

کی ہے جس کے نیچے ان کا خزانہ گڑا ہوا ہے ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا، پس تمہارے پروردگار نے چاہا، دونوں لڑکے اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ محفوظ پاکر نکال لیں، (اگر وہ دیوار گر جاتی تو ان کا خزانہ محفوظ نہ رہتا اس لئے ضروری تھا کہ اسے مضبوط کردیا جائے) یہ ان لڑکوں کے حال پر پروردگار کی ایک مہربانی تھی جو اس طرح ظہور میں آئی، اور یاد رکھو، میں نے جو کچھ کیا، اپنے اختیار سے نہیں کیا (اللہ کے حکم سے کیا) یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کرسکے!"

• علم انسانی کمال اور حقیقت اشیا تک نہیں پہونچ سکتا

پس پردہ حقیقتیں کتنی عجیب و غریب ہوتی ہیں، صورت و حقیقت اور ظاہر و باطن میں کتنا اختلاف ہے، یہ زندگی کتنی پیچیدہ اور اس کی ڈور کتنی الجھی ہوئی ہے، کائنات کتنی مبہم اور زندگی کے معمے اور پہیلیاں کتنی مشکل ہیں، اور انسان اپنے اس دعویٰ میں کس قدر جری و بیباک ہے کہ اس کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کرلیا ہے اور ہر مسئلہ کی حقیقت اور جڑ تک پہونچ گیا ہے، پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] سورہ کہف ۸۲

حضرت خضرؑ حقیقت اور واقعہ سے کتنے دور تھے، اور ان کا رویہ اعتدال و توازن سے کتنا مختلف تھا لیکن انجام کار ان کی فہم وراے کتنی درست اور مطابق حقیقت تھی، اس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ زندگی رواں دواں ہے، اس کے پاس ہر زمانہ کے لئے نئے سامان اور نئے عجائبات ہیں، وہ ہر روز اپنے نئے راز کھولتی اور نئے اسرار ظاہر کرتی ہے، اس سے یہ بھی آشکارا ہے کہ علم کی کوئی انتہا نہیں اور اس کا آخری کنارہ ہماری دسترس سے بہت دور ہے۔

وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ[۱] اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والی ہستی ہے

مادی طرز فکر کو چیلنج

یہ قصہ اپنے ان مضامین و معانی کے ساتھ جو اس میں وارد ہوئے ہیں، اس مادی فلسفہ کو چیلنج کرتا ہے جس کا کہنا یہ ہے کہ زندگی بس وہی کچھ ہے جو ہم نے سمجھا ہے، اور کائنات کا پورا علم ہم کو حاصل ہے اور حقیقت صرف وہی ہے جو آنکھوں سے نظر آئے، زندگی اور کائنات میں معیار صرف "ظاہر" ہے، اور اس پر بے خوف و خطر رائے قائم کی جا سکتی ہے، انسان اس کا حقدار ہے کہ اس دنیا کا انتظام اس کے حوالہ کیا جائے، قانون سازی کا حق اس کو حاصل ہو اس لئے کہ علم، عقل اور مطالعہ و تحقیق ہر چیز میں وہ کامل ہے، اور حقیقت اور علم کی گہرائیوں اور کائنات کی حقیقتوں تک اس کی رسائی ہو چکی ہے۔

تمام مادی فلسفوں کی ہمیشہ یہی بنیاد رہی اور جدید و معاصر تمدن بھی اسی فکر و

---

[۱] سورہ کہف۔ ۷۶

عقیدہ پر قائم ہے، سورہ کہف (اپنے مضامین و آیات میں) عمومی طور پر اور حضرت خضر و موسیٰ علیہما السلام کا یہ قصہ خصوصی طور پر اس بنیاد پر تیشہ چلاتا ہے، اور اس کو ختم کر دیتا ہے، یہ قصہ حضرت خضرؑ کے ان آخری الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔

ذَالِكَ تَأْوِيْلُ مَالَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا[1] یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے!

تاویل قرآن مجید کی اصطلاح میں حقیقت[2] کو کہتے ہیں، عجلت، انکار اور غلطی انسان کے مزاج میں ہے، لیکن بالآخر حقیقت سامنے آکر اپنی بالادستی اور جہاں گیری تسلیم کرا دیتی ہے۔

چوتھا قصہ جس پر اس سلسلہ کا اختتام ہے، ایک ایسے شخص کا قصہ ہے جو ایمان و صلاح، فائق و برتر قوت، قدرتی وسائل اور انسان کے لئے پیدا کردہ طاقتوں کی تسخیر، تمام چیزوں کا جامع تھا، اور جس نے مفسد و سرکش فاتحین اور ظالم و جابر بادشاہوں کے برخلاف ان وسائل کا استعمال صرف انسانی فلاح، انسانیت کی خدمت اور صالح تہذیب کے قیام کے لئے کیا۔

ذوالقرنین اور آہنی پشتہ کی تعمیر

ذوالقرنین کی شخصیت میں مفسرین کا اختلاف ہے، مشہور قول یہ ہے کہ وہ سکندر مقدونی تھے، امام رازی بھی اسی رائے کے مؤید اور داعی تھے، اور عام علماء اسلام کا رجحان بھی زیادہ تر یہی رہا لیکن درحقیقت اس قول کو تسلیم کرنے کیلئے

---

[1] سورہ کہف۔ ۸۲ [2] دیکھئے تفسیر سورہ اخلاص، از شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ

کوئی قوی دلیل یا محرک موجود نہیں اس لئے کہ سکندر مقدونی میں وہ صفات بالکل نہیں پائے جاتے جن کا ذکر قرآن مجید میں ذوالقرنین کے لئے آیا ہے، مثلاً ایمان باللہ، خوف خدا، عدل، اور مفتوحہ آبادیوں کے ساتھ رحم و انصاف کا برتاؤ اور اس عظیم پشتہ کا غیر معمولی کارنامہ، یہ خیال غالباً صرف اسکندر مقدونی کی تاریخ اور اس کی جنگی مہمات سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا۔

بعض معاصر فضلا اور اہل علم[1] کی رائے یہ ہے کہ یہ وہ شخص ہے جس کو اہل یونان

---

[1] خاص طور پر مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن کی جلد دوم میں اس مسئلہ پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور تاریخ کے بیانات اور یہود کی مذہبی کتابوں کے حوالہ سے اپنا نقطۂ نظر ثابت کیا ہے، انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

۵۵۹ء قبل از مسیح میں ایک غیر معمولی شخصیت (سائرس) غیر معمولی حالات کے اندر ابھری اور اچانک تمام دنیا کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں، پہلے ایران کی سلطنت دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی جنوبی حصہ پارس کہلاتا تھا اور شمال مغربی میڈیا (یہ وہ ہے جسکو عرب مورخ "ماہات" کے نام سے یاد کرتے ہیں) اس کی کوششوں سے دونوں مملکتوں نے مل کر ایک عظیم شہنشاہی کی صورت اختیار کرلی، پھر اس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا، وہ فتوحات نہیں، جو ظلم و قہر کی خوں ریزیوں سے حاصل کی جاتی تھیں بلکہ انسانیت و عدالت کی فتوحات جو تمام تر اس لئے تھیں کہ مظلوم قوموں کی دادرسی اور پامال ملکوں کی دستگیری ہو، چنانچہ ابھی بارہ برس کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ بحر اسود سے لیکر بکٹریا (BACTRIA) (باختر) تک ایشیا کی تمام عظیم الشان مملکتیں، اس کے آگے سربسجود ہو چکی تھیں۔

تخت نشینی کے بعد سب سے پہلی جنگ جو اسے پیش آئی وہ لیڈیا (LYDIA) کے

(باقی صلا پر)

SYRUS کہتے آئے ہیں، اور جس کو یہود "خورس" اور عرب مورخین کیخسرو کہتے ہیں،

(باقی صفحہ ۱۲۰ کا) پادشاہ کروشیس (CROESUS) سے تھی، لیڈیا سے مقصود ایشیائے کوچک کا مغربی اور شمالی حصہ ہے جو یونانی تمدن کا ایشیائی مرکز بن گیا تھا، اور جس کا پایہ تخت سارڈیس (SARDIS) تھا، اس جنگ میں بھی وہ فتحیاب ہوا، اب ایشیائے کوچک بحر شام سے لیکر بحر اسود تک اس کے زیر نگیں تھا، وہ برابر بڑھتا گیا یہاں تک کہ مغربی ساحل تک پہونچ گیا، قدرتی طور پر اس کے قدم یہاں پہونچ کر رک گئے اس لئے کہ سمندر کی موجوں پر چلنے کے لئے اس کے پاس کوئی سواری نہ تھی۔

جب سائرس سارڈیس کی تسخیر کے بعد آگے بڑھا ہوگا، تو یقیناً بحر ایجین (AEGEAN SEA) کے اسی ساحلی مقام پر پہونچا ہوگا جو سمرنا کے قرب و جوار میں واقع ہے، یہاں اس نے دیکھا ہوگا کہ سمندر نے ایک جھیل کی سی شکل اختیار کرلی ہے، ساحل کی کیچڑ سے پانی گندلا ہو رہا ہے، اور شام کے وقت اسی میں سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے، اسی صورت حال کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے "وجدها تغرب فی عین حمئة" (۸۶) اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج ایک گندے حوض میں ڈوب رہا ہے۔

دوسری لشکرکشی مشرق کی طرف تھی، اس پیش قدمی میں وہ مکران اور بلخ تک پہونچ گیا، اور ان وحشی اقوام پر فتح حاصل کی جو تہذیب و تمدن سے بیگانہ تھیں، یہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے اسی اشارہ کی تصدیق ہے" وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا" (۹۰) (اسے ایسی قوم ملی جو سورج کے لئے کوئی آڑ نہیں رکھتی تھی، یعنی خانہ بدوش قبائل تھے، اس کے بعد اس نے بابل جیسے مضبوط دار السلطنت پر حملہ کیا اور بنی اسرائیل کو "بخت نصر" کے مظالم سے نجات دلائی، اس طرح اس کو بنی اسرائیل کا نجات دہندہ کہا جا سکتا ہے، (باقی صفحہ ۱۲۲ پر)

لیکن ہماری نظر میں سب سے زیادہ صحیح رائے سید قطب کی ہے مناسب ہے کہ اس موقع پر ان کی پوری عبارت نقل کر دی جائے، وہ "فی ظلال القرآن" میں لکھتے ہیں:۔

"نص سے ذوالقرنین کی شخصیت اور ان کے مقام اور عہد کا کوئی علم

(باقی صہ۱۲۱ کا) یہود بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، اور اس طرح اسنے ان پیشگوئیوں کو پوری کردیا جو اس کے سلسلہ میں تورت میں آئی تھیں۔

تیسری لشکر کشی اس نے ایسے علاقہ تک کی جہاں یاجوج ماجوج کے حملے ہوا کرتے تھے، اس میں وہ بحر خزر (کاسپین) (CASPIAN SEA) کو داہنی طرف چھوڑتا ہوا کاکیشیا (CAUCASUS) کے سلسلہ کوہ تک پہونچ گیا تھا، اور وہاں اسے ایک درہ ملا تھا جو دو پہاڑی دیواروں کے درمیان تھا، ایسی راہ سے یاجوج ماجوج آکر اس طرف کے علاقہ میں تاخت وتاراج کیا کرتے تھے، اور یہیں اس نے سد تعمیر کی۔

سائرس کی وفات بالاتفاق ۵۲۹ھ قبل مسیح میں ہوئی، ۱۸۳۸ء میں اصطخر (PASARGADAE) کے کھنڈر میں سنگ مرمر کا ایک مجسمہ دریافت ہوا جسکے سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگیں تھیں جو میڈیا اور پارس کی ان دو مملکتوں کا رمز تھیں جن کو سائرس نے متحد اور زیر نگیں کیا تھا، اور جسکی وجہ سے اس کا نام "ذوالقرنین" پڑا۔ جدید مورخین نے سائرس کی حوصلہ مندی اور اس کی انصاف پرور شخصیت اور کریمانہ او صاف کی بڑی تعریف کی ہے اس سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لئے پروفیسر B. GRUNDI کا مقالہ مفید ثابت ہوگا دیکھئے، UNIVERSAL HISTORY OF THE WORLD

BY J. A. HAMMERTON

نہیں ہو پاتا، قرآنی قصوں کا یہ عام اسلوب اور خاص پہچان ہے، تاریخی انضباط اس کا مقصود نہیں، مقصود صرف قصہ سے پیدا ہونیوالی عبرت ہے، اور یہ بات اکثر اوقات زمان و مکان کے تعین کے بغیر حاصل ہو جاتی ہے۔

ہماری مدون تاریخ میں ایک شخصیت کا نام ضرور آتا ہے جس کو سکندر ذوالقرنین کہا گیا ہے، لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ قرآن مجید کا ذوالقرنین ہرگز نہیں، اس لئے کہ یہ یونانی سکندر مشرک و بت پرست تھا، اور قرآن میں جن کا ذکر ہے، وہ مومن، موحد حشر و نشر اور یوم آخرت کے قائل تھے۔

ابوالریحان بیرونی اپنی کتاب "الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ" میں لکھتے ہیں۔ کہ قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے، وہ حمیر سے تعلق رکھتے تھے، اس کا علم ان کے نام کی ترکیب سے ہوتا ہے، اس لئے کہ حمیر کے سلاطین اپنے القاب میں "ذو" ضرور لگاتے تھے، مثلاً ذونواس ذویزن، ان کا نام ابوبکر بن افریقش تھا، انھوں نے بحر روم کے ساحل تک فوج کشی کی، تونس مراقش اور دوسرے ممالک سے بھی گزرے، انھوں نے افریقیہ کے نام سے شہر آباد کیا تھا، جو بعد میں پورے براعظم کا نام ہوگیا، ان کو ذوالقرنین اس لئے کہا گیا کہ وہ سورج کے دونوں کناروں تک پہونچ گئے۔"

ہو سکتا ہے کہ یہ قول صحیح ہو، لیکن آج اس کے جانچنے کے لئے

ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں، اس لئے کہ جتنی تاریخ اب تک لکھی جاچکی ہے، اس میں ذوالقرنین کی تلاش بے سود ہے، ان کی جو سیرت اور حالات زندگی قرآن نے بیان کئے ہیں، اس کا حال بھی ان احوال کی طرح ہے، جو قرآن مجید نے قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح وغیرہ کے سلسلہ میں بیان کئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ کی عمر انسانیت کی عمر کے مقابلہ میں بہت کم ہے، مرتب تاریخ سے پہلے بکثرت واقعات گزر چکے ہیں، جن کا علم تاریخ کو بالکل نہیں، اس لئے اس سلسلہ میں اسکا فتویٰ بالکل معتبر نہیں۔

توریت اگر تحریف اور اضافات سے محفوظ رہتی تو وہ البتہ اس طرح کے بعض واقعات کے لئے سند بن سکتی تھی، لیکن اس میں ایسی کہانیاں شامل کر دی گئی ہیں، جن کی افسانویت میں کوئی شبہہ ہی نہیں ہو سکتا، اس میں بکثرت روایات بڑھائی گئی ہیں، اور وحی الٰہی کا حصہ اس میں خلط ملط ہو گیا ہے، اس لحاظ سے توریت بھی تاریخی واقعات میں کوئی یقینی مرجع باقی نہیں رہی۔

اب صرف قرآن باقی رہا جو تحریف اور تغیرات سے محفوظ ہے، وہ ان تاریخی قصوں کی واحد سند اور سرچشمہ ہے، جو اس میں وارد ہوئے ہیں، اور بدیہی طور پر قرآن کا محاکمہ تاریخ کے ذریعہ نہیں ہو سکتا، اس کے دو سبب ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ تاریخ نئی پیداوار ہے، تاریخ انسانی کے بے شمار واقعات اس کے علم میں نہیں، دوسری طرف

قرآن ان سب واقعات سے پردہ اٹھاتا ہے جن کا ذکر تاریخ کے ریکارڈ میں نہیں ملتا۔

دوسری بات یہ کہ تاریخ (خواہ اس میں ان واقعات کا ذکر موجود ہو) بہرحال ایک بشری عمل ہے، اور انسانی اعمال میں خطا و تحریف اور کوتاہ نظری کی جو آلودگی پائی جاتی ہے، وہ قدرتی طور پر اس میں بھی ہے ہم اپنے موجودہ زمانہ میں (جس میں مواصلات و ملاقات کے وسائل اور تحقیق و تفتیش کے ذرائع سہولت کے ساتھ میسر ہیں) یہ دیکھتے ہیں کہ ان سہولتوں کے باوجود ایک خبر اور ایک واقعہ مختلف طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے، اس کو مختلف زاویوں سے دیکھا جاتا ہے، اس کی متضاد تشریحیں کی جاتی ہیں، اور مختلف نتائج نکالے جاتے ہیں، یہ وہ حقیقی ملبہ ہے، جس سے تاریخ تیار کی جاتی ہے، خواہ اس کے بعد اس کو بحث و نظر اور جانچنے پرکھنے کا اعلیٰ معیار تسلیم کر لیا جائے۔

اس لئے محض یہ کہنا کہ قرآنی قصوں کے بارہ میں تاریخ کا فتویٰ جاننا ضروری ہے، ان قواعد علمی اور اصول موضوعہ کے بھی خلاف ہے، جس پر انسانوں کا عام اتفاق ہے، علاوہ اس کے کہ یہ بات اس عقیدہ کے بھی سراسر خلاف ہے، جو قرآن کی بات کو فیصلہ کن مانتا ہے، اس کو نہ قرآن پر ایمان لانے والا تسلیم کر سکتا ہے نہ بحث علمی کے ذرائع پر بھروسہ رکھنے والا، اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ صرف اندازوں، قیاسات، اور خیالات کی ہے۔

لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ذوالقرنین کے بارہ
میں سوال کیا تھا، اس پر اللہ تعالےٰ نے آپ پر وحی نازل کی جس میں
ان کی سیرت پر کچھ واضح اشارات موجود ہیں، چونکہ قرآن مجید ہی
اس کا واحد سرچشمہ ہے، اس لئے بغیر علم وتحقیق کے اس میں توسع
کی کوشش ہمارے بس سے باہر ہے، تفسیر کی کتابوں میں بہت سے
اقوال آئے ہیں، لیکن ان پر یقین کے ساتھ اعتماد نہیں کیا جا سکتا،
اس میں سے اگر کچھ لینا ہے، تو احتیاط کو مد نظر رکھنا چاہیئے اسلئے کہ
اسرائیلیات اور روایات بھی اس میں شامل ہو گئی ہیں"[1]

صالح اور مصلح بادشاہ

بہر حال ہم کو معین طور پر کسی ایسی شخصیت کا پتہ لگے یا نہ لگے جس کو ہم
ذوالقرنین کہہ سکتے ہیں، اور اس پر وہ ساری تفصیلات منطبق کر سکتے ہیں، جو قرآن
میں آئی ہیں، اور وہ ناقص اور ادھوری تاریخ ہماری رہنمائی کرے یا نہ کرے جو
بہت آخر میں مرتب ہونا شروع ہوئی اور جس پر قطعیت کے ساتھ کوئی رائے
قائم کرنا بہت دشوار ہے، اس سے قرآن کے طالب علم کو کوئی نقصان نہیں
پہونچتا، اس لئے کہ ان کے سب ضروری اوصاف ہمارے سامنے ہیں، ان کو
اللہ تعالےٰ نے طاقت، ذرائع ووسائل، علو ہمت، حوصلہ مندی اور عالی ظرفی
عطا کی تھی۔

---

[1] فی ظلال القرآن حصہ ششم طبع پنجم ص ۹۰-۱۰ از سید قطب

اٰتَیْنَاہُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا فَاَتْبَعَ سَبَبًا[1]

نیز اس کے لئے ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا تو (دیکھو) اس نے (پہلے) ایک (مہم کے لئے) ساز و سامان کیا۔

ان کی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع تھا، اور ایک طرف مشرق کے آخری کنارے اور دوسری طرف مغرب کے انتہائی سرے تک پہونچ گیا تھا، جس کو قرآن مجید میں مطلع الشمس اور مغرب الشمس سے تعبیر کیا گیا ہے وہ اپنی ان ساری فتوحات اور کارناموں میں ہمیشہ صالح و مصلح، حق کے حامی، ضعیفوں کے مونس و غمخوار، سرکشوں اور ظالموں کے لئے تازیانۂ عبرت رہے، ان کا اصول اور پروگرام ہمیشہ وہ رہا جو قرآن نے ان کی زبان سے بیان کیا ہے۔

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا، وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا[2]

ذوالقرنین نے کہا "ہم ناانصافی کرنے والے نہیں، جو سرکشی کریگا، اسے ضرور سزا دیں گے، پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے، وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کرے گا، اور جو ایمان لائیگا اور اچھے کام کریگا، تو اس کے بدلے اسے بھلائی ملے گی، اور ہم اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جس میں اس کے لئے آسانی و راحت ہو۔

---

[1] سورہ کہف۔ ۸۴، ۸۵ [2] ایضاً ۸۷، ۸۸

اس اصول میں جو پاکیزگی و صداقت، اس پروگرام میں جو کمال و اعتدال، اور اس کیرکٹر میں جو اخلاقی بلندی اور حسن سیرت نمایاں ہے، اس کی تشریح و توضیح کی چنداں ضرورت نہیں۔

اپنی ان پیشقدمیوں اور فتوحات کے زمانہ میں ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو پہاڑوں کے درمیان آباد تھی اور ہمیشہ خطرات میں گرفتار اور اندیشوں کا شکار تھی، اور ایک وحشی اور جنگلی قوم (جو پہاڑ کی اوٹ میں تھی) کے حملوں کا نشانہ بنتی تھی، قرآن اور دوسرے صحف سماوی میں اس قوم کو یاجوج ماجوج کہا گیا ہے[1]

---

[1] اس مسئلہ میں سید قطب نے جو رائے ظاہر کی ہے اس سے ہم کو پورا اتفاق ہے وہ کہتے ہیں۔

"ہم قطعیت کے ساتھ اس جگہ کا تعین نہیں کر سکتے جہاں دو دروں کے درمیان ذوالقرنین کا گزر ہوا تھا، نہ وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دو درے کیا تھے اور کیسے تھے؟ نص سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی وادی یا گذرگاہ میں پہونچے جو دو طبعی یا مصنوعی دروں کے درمیان واقع تھی، اور جس میں کوئی پسماندہ اور کمزور قوم رہتی تھی، (لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا) جو ان کی بات بھی ٹھیک سے نہیں سمجھ پاتے تھے"

(ج ۱۴ صـ۱۳)

جہاں تک یاجوج ماجوج کا تعلق ہے ان کی قومیت و وطنیت کے تعین اور انکے زمانۂ خروج اور پشتہ کی تباہی و بربادی کا مسئلہ ہے اس کی بحث بہت طویل ہے اور وہ تفسیر کی کتابوں اور احادیث میں قرب قیامت کی علامات اور لڑائیوں کے تذکرہ کے باب میں مذکور ہے، لیکن بالکل صحیح تعین اور جزم کے ساتھ کسی نتیجہ پر پہونچنا آسان نہیں (باقی صـ۱۲۹ پر)

یہ قوم باہم دست وگریباں اور خانہ جنگی کا شکار تھی، اور اس کے افراد ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ۔[۱]

اور اس روز ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے کہ (سمندر کی موجوں کی طرح) ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں۔

انھوں نے محسوس کیا کہ یہ موقع بہت قیمتی ہے، اللہ تعالےٰ نے انکے لئے ایک طاقتور اور صالح بادشاہ کا پردۂ غیب سے انتظام کردیا ہے، انھوں نے ان سے درخواست کی کہ ان وحشی انسانوں، ظالموں، اور فسادیوں سے حفاظت کی کوئی صورت کردیں اور اپنے عظیم وسائل اور کثیر فوج کے ذریعہ کوئی ایسا پشتہ اور دیوار بنادیں جو یاجوج ماجوج کا راستہ روک دے، انھوں نے اس کے لئے یہ پیشکش بھی کی کہ مالی طور پر وہ اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔

اس صالح مرد نے ان کی یہ درخواست قبول کی، ان سے اس پشتہ کی تعمیر کا وعدہ

(باقی صفحہ ۱۲۸ کا) اس لئے اس سلسلہ میں متقدمین و متاخرین نے جو کلام کیا ہے (اگرچہ اس کی مقدار و تعداد بھی زیادہ نہیں) اس کی طرف رجوع کرنا چاہئے، تاہم احادیث کا وہ حصہ جو فتن و ملاحم اور قرب قیامت کی تفصیلات و واقعات سے متعلق ہے کسی ایسے عالی ہمت، علوم دینیہ کے جوہر شناس اور تاریخ کے ماہر شخص کا اب بھی منتظر ہے جو صبر آزما بحث و جستجو اور تحقیق و مطالعہ سے کام لے کر اس پر غور کرے، مخلص اور صحیح العقیدہ ہو، اس لئے کہ یہ موضوع بہت اہم، دقیق اور وسیع ہے اور بہت احتیاط اور کاوش کا محتاج ہے!

[۱] سورہ کہف۔ ۹۹

کیا لیکن بہت سے لالچی اور حریص بادشاہوں اور حکمرانوں کے برعکس ان کی مالی مدد قبول نہیں کی، بلکہ جو کچھ اللہ نے ان کو دے رکھا تھا، اسی کو صرف کیا، انھوں نے یہ کہا کہ اپنے زور بازو کے ذریعہ نیز وہاں جو فولاد پایا جاتا ہے، اس کے ذریعہ وہ مدد کریں۔

قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ[۱]

ذوالقرنین نے کہا "میرے پروردگار نے جو میرے قبضہ میں دے رکھا ہے، وہی میرے لئے بہتر ہے (تمہارے خراج کا محتاج نہیں) مگر تم اپنی قوت سے (اس کام میں) میری مدد کرو میں تمہارے اور یاجوج ماجوج کے درمیان ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دوں گا" (اس کے بعد اس نے حکم دیا) "لوہے کی سلیں میرے لئے مہیا کر دو۔"

سب نے مل کر اس مبارک وکار آمد پشتہ کی تعمیر میں حصہ لیا ایک طرف اس صالح سلطان کی حکمت وصنائی تھی، دوسری طرف محنت ومزدوری اور ضروری سامان یعنی فولاد تھا۔

حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انفُخُوا حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ

پھر جب (تمام سامان مہیا ہو گیا، اور) دونوں پہاڑوں کے درمیان دیوار اٹھا کر ان کے برابر بلند کر دی، تو حکم دیا "بھٹیاں سلگاؤ

---

[۱] سورہ کہف - ۹۵ - ۹۶

عَلَيۡهِ قِطۡرًا۔[۱] اور اسے دھونکو" پھر جب (اس قدر دھونکا گیا کہ) بالکل آگ (کی طرح لال) ہوگئی، تو کہا" گلا ہوا تانبا لاؤ، اس پر انڈیل دیں۔"

بالآخر یہ پشتہ بن کر تیار ہوا، اور اس کی وجہ سے ساری قوم ان دونوں پہاڑوں کے پیچھے بسنے والے دشمنوں سے محفوظ ہوگئی،

فَمَا اسۡطَاعُوۡۤا اَنۡ يَّظۡهَرُوۡهُ وَمَا اسۡتَطَاعُوۡا لَهٗ نَقۡبًا۔[۲] چنانچہ (اس طرح) ایک ایسی سد بن گئی کہ (یاجوج اور ماجوج) نہ تو اس پر چڑھ سکتے تھے، نہ اس میں سرنگ لگا سکتے تھے!

حکیم و دانا مومن کی بصیرت اور دینی سمجھ

یہ وہ موقع ہے جہاں اس طاقتور بادشاہ کے دل میں جو قوموں کا فاتح اور جہانگیر و جہاں کشا تھا، ایمان نے جوش مارا، نہ ان کے دل میں خود پسندی کی کوئی لہر پیدا ہوئی نہ غفلت یا تکبر کا سایہ ان پر پڑ سکا، انھوں نے یہ نہیں کہا کہ "اِنَّمَاۤ اُوۡتِيۡتُهٗ عَلٰى عِلۡمٍ عِنۡدِىۡ"[۳] بلکہ اس سب کا انتساب انھوں نے اللہ کی طرف کیا اور اس دھوکہ میں نہیں پڑے کہ ان کا یہ کارنامہ لافانی اور یہ پشتہ ناقابل تسخیر ہے، انھوں نے ایک صاحب بصیرت اور صاحب فراست مومن کی طرح جو آخرت پر یقین رکھتا ہے، اور انسانی کمزوری و ناتوانی

---

[۱] سورہ کہف۔ ۹۶ [۲] ایضاً۔ ۹۷ [۳] یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے (قصص۔ ۷۰)

اورزمانہ کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ ہے صرف یہ کہا۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّي فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا۔[1]

ذوالقرنین نے (تکمیل کار کے بعد) کہا یہ (جو کچھ ہوا، توفی الحقیقت) میرے پروردگار کی مہربانی ہے، جب میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات ظہور میں آئیگی، تو وہ اسے ڈھا کر ریزہ ریزہ کردیگا (مگر اس سے پہلے کوئی اسے ڈھا نہیں سکتا) اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے، ٹلنے والی نہیں!"

یہ اس بااقتدار و باخبر انسان کا کردار ہے، جو قطعی طاقتوں اور مادی وسائل کو مسخر کرلیتا ہے، اور اسباب و ذرائع کی زمام اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے، اس کی فتوحات اور کارناموں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوجاتا ہے، لیکن اپنی مادی قوت اور اقتدار و سلطنت کے انتہائی عروج اور وسعت کے موقع پر بھی وہ اپنے رب کو نہیں بھولتا، اس کے سامنے اس کا سر ہمیشہ خم اور گردن جھکی رہتی ہے، آخرت اس کے مدنظر ہوتی ہے، اور اس کے لئے وہ ہر وقت کوشاں اور لرزاں و ترساں رہتا ہے، اپنے ضعف و ناتوانی کا اقرار کرتا ہے، انسانیت اور کمزور اقوام کے ساتھ رحم کا معاملہ کرتا ہے، حق کی حمایت کرتا ہے، اور اپنی ساری قوت و صلاحیت، سعی و جد و جہد، اور ذرائع و وسائل انسانیت کی خدمت صالح سوسائٹی کی تعمیر، اعلاء کلمۃ اللہ اور انسانوں کو اندھیروں سے روشنی میں

---

[1] سورہ کہف ۹۸

لانے اور مادیت کی بندگی سے خدا کی بندگی میں داخل کرنے پر صرف کرتا ہے، یہ وہ کردار ہے، جس کی نمائندگی سلیمان بن داؤد علیہ السلام اپنے عہد میں، ذوالقرنین اپنے زمانہ میں، خلفاء راشدین اپنے دور میں، اور ائمہ اسلام مختلف زمانوں اور ملکوں میں برابر کرتے رہے۔

خالق کائنات سے بغاوت مغربی تہذیب کا مزاج ہے

تاریخ کے چند افسوسناک سانحوں میں ایک المناک سانحہ اور انسانیت کی ایک بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ مغربی تہذیب ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئی، اور پروان چڑھی جس میں دین سے بغاوت اور ایمان بالغیب کا انکار عام ہو چکا تھا، یہ ایک ایسی قوم کے درمیان پیدا ہوئی جو ان تمام لوگوں سے باغی تھی، جو دین کے دعوے دار بن کر اس کو اپنی نفسانی خواہشات، انانیت، اور مفادات کی تکمیل کے لئے استعمال کر رہے تھے، ان کی غلط کرداری، تعصب، وحشت، ترقی سے نفرت اور عقل اور علم کی راہ میں رکاوٹ بننے کی وجہ سے وہ ان سے حد درجہ بیزار اور متنفر تھی[1]، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمدن وصنعت کا نشوونما اور زندگی کی نئی تنظیم خالص مادی بنیادوں پر ہونے لگی، معاشرہ اور انسانی افراد کا تعلق ان کے پیدا کرنے والے اور کائنات کے خالق و مالک سے ٹوٹ گیا، یہ سب ایک سلسلۂ اسباب کا نتیجہ تھا، جس میں مزاج، افتاد طبع حالات کا تقاضہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ہماری کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" (فصل اول باب چہارم)

اور یورپ کے مخصوص نظام زندگی سب کو دخل ہے، اس تہذیب کا ارتقا اور نشو و نما الحاد اور اخلاقی فساد کے ساتھ ہوا، دوسری طرف اسباب و ذرائع کی تسخیر صنعتی ترقی، اور طبعی علوم میں وہ اپنی انتہا کو پہونچ گئی، فاصلے اور مسافتیں معدوم ہوگئیں اور انسان کرۂ ہوائی سے پار ہوگیا اور آخر میں اس نے چاند پر بھی اپنا قدم رکھ دیا، اس کے علاوہ طبعیات و فلکیات کے میدان میں بکثرت دوسری فتوحات اس نے حاصل کیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی مادی طاقت طبعی قوتوں کی تسخیر، کائنات پر اقتدار کفر اور مادہ پرستی کے ساتھ بالکل گھل مل گیا ہے، اور یہ مغربی تہذیب کی مخصوص علامت، اس کی امتیازی خصوصیت اور نمایاں پہچان بن گئی ہے، ہم کو کسی ایسی تہذیب اور تمدن کا علم نہیں جو اس درجہ مادی قوت رکھنے کے ساتھ مذاہب و اخلاق سے اس درجہ برسرجنگ ہو، خالق کائنات اور اس کے بنائی ہوئی شریعت اور دستور و قانون کا اس طرح باغی و منکر اور مادیت کی پرستش، نفس کی غلامی اور ربوبیت کے دعوی میں اس طرح مبتلا ہو جس طرح یہ مغربی تہذیب!

مادی تمدن کا نقطۂ اختتام

ہم نے ابھی ذکر کیا کہ مغربی تہذیب کا نشو و نما اس طرح ہوا ہے، کہ کائنات کا اقتدار اس کو حاصل ہے، لیکن وہ خدا کی منکر اور عادت کی اسیر بھی ہے، اس کے ذمہ دار اور نمائندے اپنی قوت اور صنعت کے سوا اور کسی چیز پر

یقین نہیں رکھتے، اور اپنی مصلحت اور غرض کے سوا کسی اور چیز کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے، اس کے بڑے مراکز ـــــ امریکہ یورپ اور روس ـــــ کبھی اعلان کے ساتھ اور کبھی بغیر اعلان کے غیبی حقائق، روحانیت، اخلاق، اور آسمانی نظام سے مستقل برسرپیکار رہیں، اور حالت جنگ میں ہیں، اور اب وہ زمانہ قریب ہے، کہ جب یہ تہذیب، مادیت اور صنعتی ترقی نقطۂ اختتام پر پہونچ جائے گی اور اس کا وہ سب سے بڑا نمائندہ اور ذمہ دار ظاہر ہوگا، جس کو نبوت کی زبان میں دجّال کہا گیا ہے[۱]، اور جو ایک طرف مادی اور صنعتی عروج اور دوسری طرف کفر

---

[۱] جن احادیث میں دجال کا ذکر آیا ہے اور اس کے اوصاف وعلامات بیان کئے گئے ہیں، وہ تواتر معنوی کی حد تک پہونچ چکی ہیں، ان میں صاف اس کی صراحت ہے کہ وہ ایک معیّن شخص ہوگا جس کے کچھ معین صفات ہوں گے، وہ ایک خاص اور معین زمانہ میں ظاہر ہوگا (جس کی صحیح تاریخ اور وقت سے ہم کو آگاہ نہیں کیا گیا ہے) نیز ایک معین قوم میں ظاہر ہوگا جو یہود ہیں۔ اس لئے ان تمام وضاحتوں کی موجودگی میں نہ اس کے انکار کی گنجائش ہے نہ ضرورت، احادیث میں اس کا بھی تعین کر دیا گیا ہے کہ وہ فلسطین میں ظاہر ہوگا، اور وہاں اس کو عروج وغلبہ حاصل ہوگا، درحقیقت فلسطین وہ آخری اسٹیج ہے، جہاں ایمان ومادیت اور حق وباطل کی یہ کشمکش جاری ہے، اور منظر عام پر آنے والی ہے، ایک طرف اخلاقی اور قانونی حقوق رکھنے والی قوم ہے، جن کا سب سے بڑا ہتھیار اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے، کہ وہ دین اور دعوت الی اللہ کے حامل ہیں، اور انسانیت کی فلاح اور مساوات کے داعی ہیں، دوسری طرف وہ قوم ہے جو ایک خاص نسل اور خون کے تقدس و برتری کی قائل ہے، اور پورے عالم اور انسانیت کے سارے وسائل کو اس نسل اور

(باقی صـ۱۳۶ پر)

مادیت والحاد کی دعوت، طبعی قوتوں کی پرستش، اور اس کے مسخر کرنے والوں کی غلامی و بندگی کے بالکل آخری اور انتہائی نقطہ پر ہوگا، اور یہ عہد آخر کا سب سے بڑا فتنہ، دنیا کی سب سے بڑی مصیبت، اور اس مادی تہذیب کا نقطۂ عروج یا نقطۂ اختتام ہوگا، جو کئی سو برس پہلے یورپ میں ظاہر ہوئی تھی۔

دجال کی علامت کفر، فساد اور تباہ کاری

اوپر جو کچھ گزرا ہے، وہ سب اس مادی، صنعتی اور مشینی تہذیب کی تصویر ہے، جو بالآخر اپنی انتہا کو پہونچنے والی ہے، اور جس کا جھنڈا آخر میں دجال کے ہاتھ میں ہوگا، لیکن صرف یہی بات اس کو دجال بنانے کے لئے کافی نہیں لسان نبوت نے اس کی جس تفصیل، تاکید، اور اہتمام کے ساتھ مذمت کی ہے، اسکے فتنہ اور ابتلا سے جس طرح ڈرایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بات اس سے زیادہ اہم ہے، اسباب و وسائل اور قوت مادی حضرت سلیمانؑ کو بھی حاصل تھی اور ذوالقرنین کو بھی، اور قرآن مجید نے دونوں کی طاقت، ذرائع و وسائل کی تسخیر، نیز سرعت و تیز رفتاری کا ذکر کیا ہے، اس لئے ہمیں سوچنا

(باقی صفحہ ۱۳۵ کا) عنصر کے اقتدار و سیادت کے اندر لے آنا چاہتی ہے اور فنی صلاحیتوں اور علوم طبعیہ کے وسائل و ذرائع کا بہت بڑا ذخیرہ اس کو حاصل ہے، انسانیت کے اس حقیقی اور فیصلہ کن معرکہ کے آثار مشرق عربی اور مشرق اسلامی کے افق پر اب ظاہر ہو چکے ہیں، اور حالات و واقعات وہ مناسب فضا اور ماحول تیار کر رہے ہیں، جس میں یہ کہانی اپنے سچے کرداروں کے ساتھ دہرائی جائے گی۔

چاہیئے کہ وہ خط فاصل کیا ہے، جو ان کو دجال سے علیٰحدہ کرتا ہے، وہ کون سی نازک لائن ہے، جو ایک صالح و پاکباز اور باخبر و با اختیار بادشاہ میں جس کی تعریف قرآن مجید میں یہ آئی ہے۔

نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ[1] — بڑا ہی اچھا بندہ ہے، وہ اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والا ہے،

اور ایک فتنہ انگیز اور عالم آشوب شخصیت میں امتیاز پیدا کرتی ہے، جس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بار بار متنبہ کیا ہے، اپنی امت کو بار بار اس سے ڈرایا ہے، اور بہت اہتمام کے ساتھ اس کی تشریح، وضاحت اور تاکید کی ہے۔

یہ حد فاصل اور سرحدی خط یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ اور ذوالقرنین (نیز اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اس طرح کے جتنے نمونے انفرادی یا اجتماعی شکل میں سامنے آئے) ان کے اندر فائق قوت، ملکی وسعت و استحکام، غیر معمولی اور حیرت انگیز حکمت و فراست، بہترین اور اعلیٰ مقاصد، دعوت الی اللہ اور اپنے علم و حکمت اور قوت، صلاحیت کو ہدایت، بنی نوع انسان کی فلاح، اور عدل و انصاف کے لئے استعمال کرنے کی خواہش اور صلاحیت کا بہترین اجتماع تھا، اللہ تعالےٰ نے ان لوگوں کے اوصاف اس طرح بیان فرمائے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ — یہ (مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انھیں صاحب اقتدار کر دیا،

---

[1] سورہ ص ۔۔ ۳۰

وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔[1]

(یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز کا نظم قائم کریں گے، زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیاں روکیں گے، اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔[2]

وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دیں گے، جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے، اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں، اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لئے ہے۔

اس کے برعکس دجال کی پہچان، علامت اور خصوصیت جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بتائی وہ "کفر" ہے، جو اپنے وسیع ترمعانی پر مشتمل ہے، حدیث صحیح میں آتا ہے۔

انہ مکتوب بین عینیہ ک، ف، ر یقرأہ کل مومن کاتب وغیر کاتب[3]

اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ک، ف، ر لکھا ہوگا جس کو ہر مومن پڑھ سکے گا، خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا نہ ہو۔

---

[1] سورہ حج ۴۱ [2] سورہ قصص ۸۳ [3] صحیح بخاری۔

زندگی اور معاشرہ پر دجّال کا اثر

احادیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت داعی اور گرم جوش، چست و چالاک اور مذاہب و اخلاق کے مقابلہ میں کفر اور بغاوت کا علمبردار ہوگا، ایک دوسری حدیث میں ہے۔

فواللہ ان الرجل لیأتیہ وھو یحسب انہ مومن فیتبعہ مما یبعث بہ الشبہات[1]۔

خدا کی قسم آدمی اس کے پاس آئے گا وہ سمجھتا ہوگا کہ وہ مومن ہے، پھر اس کا تبع بن جائے گا، ان شبہات کی وجہ سے جو وہ اس کے دل میں پیدا کردے گا۔

اس کا معاملہ اتنا آگے بڑھے گا اور اس کی دعوت اس قدر عام ہو گی کہ کوئی گھرانہ اور خاندان اس سے محفوظ نہ رہے گا، نہ عورتیں اور نہ لڑکیاں اس کے اثر اور سحر سے آزاد رہ سکیں گی، گھر کا بڑا اور ذمہ دار اپنے گھر والوں، اپنی بیوی اور عورتوں اور لڑکیوں پر کوئی کنٹرول قائم نہ رکھ سکے گا، اور سب شتر بے مہار ہو جائیں گے۔

حدیث میں آیا ہے کہ:۔

ینزل الدجال بھذہ السبخۃ بمرقناۃ فیکون آخر من

دجال آکر اس شور قطعۂ زمین "مرقناۃ" میں پڑاؤ کریگا، آخر میں اس کے پاس

---

[1] ابوداؤد

یخرج الیہ النساء حتیٰ ان	عورتیں گھروں سے نکل کے جائیں گی یہاں تک کہ
الرجل لیرجع الی امہ وابنتہ	آدمی اپنی ماں، اپنی بیٹی اپنی بہن اور اپنی پھوپھی
اختہ وعمتہ فیوثقہا	کے پاس جائے گا، اور ان کو باندھ کے
رباطاً مخافۃ ان تخرج	مقید کردیگا، اس اندیشہ سے کہ یہ دجال
الیہ[1]	کے پاس جائیں۔

سوسائٹی کا فساد اور اخلاقی انحطاط اور زوال اس درجہ پر پہونچ جائے گا کہ حدیث کے الفاظ ہیں:۔

فیبقی شرار الناس فی خفۃ	صرف برے لوگ باقی رہ جائیں گے،
الطیر واحلام السباع،	جو چڑیوں کی طرح ہلکے اور درندوں
لایعرفون معروفاً ولاینکرون	کی سی عقلیں رکھنے والے ہوں گے، نہ
منکراً[2]	اچھائی کو وہ اچھائی سمجھیں گے، نہ برائی
	کو برائی۔

موجودہ ابرتانہ اور کافرانہ تہذیب کی یہ وہ بلیغ تعبیر اور زندہ تصویر ہے، جس میں اس کے نقطۂ عروج کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے، اور اس کے اہم مرکزوں اور قلعوں کی بہت واضح طور پر نشان دہی کر دی گئی ہے، یہ دراصل نبوت کے ان لافانی معجزوں میں سے ایک معجزہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس جامع ومانع کلام کا ایک بہترین نمونہ ہے، جس کے عجائبات

---

[1] طبرانی عن ابن عمر رضی اللہ عنہ

[2] صحیح مسلم (روایت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ)

وکمالات کبھی ختم نہیں ہوتے، اور جس کی تازگی اور حدت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ تہذیب میں ایک طرف پرندوں کاسا ہلکاپن ہے، کہ وہ فضاؤں میں اڑ رہی ہے اور ہوا کو تسخیر کر رہی ہے، اور اس نے جدید انسان کو پرندہ سے تیز رفتار اور سبک بنا دیا ہے، دوسری طرف اس میں درندگی، خونخواری، اور مردم آزاری کی وہ صفت ہے، جس سے وہ پورے پورے ملکوں اور قوموں کو نیست و نابود کرنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتی، اور نہ صرف لہلہاتی فصلوں اور گل و گلزار زمینوں کو بلکہ باغ انسانی کو اس طرح تباہ و برباد کرتی ہے، کہ اس کی نظیر تاریخ میں نظر نہیں آتی، اور یہ سب عیش و آرام، رزق کی فراوانی، راحت و آسائش اور آرائش و زیبائش کے اس ساز و سامان اور اسباب و وسائل کے ساتھ ہے جو شائد تاریخ کے کسی اور دور میں اتنی کثرت و عمومیت سے مہیا نہ ہوئے تھے۔

حدیث میں آتا ہے:۔

وھم فی ذلک دار رزقھم، حسن عیشھم۔[۱]	اس حالت میں انکا رزق ہن کی طرح برس رہا ہوگا اور عیش کے سب سامان مہیا ہوں گے۔

وہ سمجھتے ہونگے کہ ہم بہت اچھا کر رہے ہیں

یہ تہذیب جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس عالم مادی اور حیات

---

[۱] صحیح مسلم (روایت عبداللہ بن عمرؓ)

دینوی کے سوا ہر چیز کی منکر ہے، اور اس نے اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں اسی زندگی کی ترقی و خوشحالی اور تفریح و خوش طبعی پر مرکوز کردی ہیں، اس لئے اللہ تعالےٰ نے اس سورہ کی آخری آیات کے ضمن میں بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس بات سے آگاہ کیا ہے، اور اس میں مادی تہذیب کے تمام علمبرداروں اور ذمہ داروں اور عالم اسلام میں ان کے وفادار اور ہونہار شاگردوں کو اور زیادہ تعین کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے اور ان کی ایسی نازک اور سچی تصویر کھینچ دی گئی ہے، جس میں ان کے خدو خال اور چہرہ کا اتار چڑھاؤ تک ابھر آیا ہے، یہ وہ آیات ہیں، جن میں ملحدانہ مادیت اور اس کے دجالی رہنماؤں کا پردہ فاش کیا گیا اور ان کے اصل مکروہ کردار کو ظاہر کردیا گیا ہے۔

إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ [1]

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے، ملک میں خرابی نہ پھیلاؤ (اور بدعملیوں سے باز آجاؤ) تو کہتے ہیں، (ہمارے کام خرابی کے باعث کیسے ہوسکتے ہیں) ہم ہی تو سنوارنے والے ہیں۔

یہ تصویر ان یہودیوں پر سب سے زیادہ منطبق ہے جنھوں نے تازیانوں اور تنبیہوں سے اتنی بھری ہوئی اور طویل تاریخ کے باوجود آخرت کو فراموش کردیا، اس سے ان کی عالمی سرگرمیوں پر بھی زو پڑتی ہے جس نے عقل و حکمت،

---

[1] سورہ بقرہ۔ ۱۱

صنعت و سائنس، سیاست، حکومتوں کے انقلاب اور بغاوتوں میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے، اور اپنی غیر معمولی ذکاوت اور فکری و عملی صلاحیتوں کو صرف تخریبی اور منفی مقاصد، انتشار پیدا کرنے اور انارکی پھیلانے، طاقت کے لئے کشمکش، اور ایک نسل یعنی مقدس نسل اسرائیلی کی برتری اور صرف ایک قوم یعنی اللہ کی "پسندیدہ امت" کی سیادت پر مرکوز کریں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا[۱]

(اے پیغمبرا) تو کہدے "ہم تمہیں خبر دیں کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہوئے؟ وہ، جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں، اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کارخانہ بنا رہے ہیں! ایسی لوگ ہیں کہ اپنے پروردگار کی آیتوں سے اور اس کے حضور حاضر ہونے سے منکر ہوئے، پس ان کے سارے کام اکارت گئے اور اس لئے قیامت کے دن ہم ان (کے اعمال) کا کوئی وزن تسلیم نہیں کریں گے

علم اور عقل انسانی کی کوتاہ نظری

قرآن مجید کائنات کے اس محدود تصور اور ناقص علم انسانی پر دوبارہ

---

[۱] سورہ کہف ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵۔

ضرب لگاتا ہے، جو اس وسیع کائنات کا علم رکھنے کا دعویدار ہے، اور ارض وسما، مخلوقات وموجودات، ستاروں اور سیاروں، بر وبحر، فضا اور خلائے بسیط نیز علم الٰہی سے تعلق رکھنے والی اور تمام اشیاء کو بھی اپنے علم کا پابند اور تنگ وتاز کی زد میں سمجھتا ہے، اور علم کے یہ نام لیوا علم کائنات کی خوب تشہیر کرتے ہیں اور اس پر بہت ناز کرتے ہیں، حالانکہ ان کے معلومات سمندر کے ایک قطرہ اور صحرا کے ایک ذرہ کے برابر بھی نہیں پہونچ سکے ہیں، یہ خود پسندی، فخر وغرور اپنے معلومات وتحقیقات اور کسی خاص دور کے انسانی علم کے ذخیرہ پر حد سے بڑھا ہوا اعتماد، اور اس کے سوا ہر چیز سے انکار، یہ تکبر، خود رائی، خود ستائی، فکر کی تنگی اور نظر کی پستی وہ ابتدائی "جرثومہ" یا مادہ ہے جس نے مادیت کو اپنے سارے معانی ومقاصد کے ساتھ یا یوں کہئے کہ اپنے تمام شرور ومفاسد کے ساتھ وجود بخشا ہے۔

یہ وہ بگڑی ہوئی انسانی نفسیات ہے جس نے کبھی ظلم وسرکشی پر آمادہ کیا ہے کبھی الوہیت وربوبیت کے دعویٰ پر اکسایا ہے، اسی نے ان لوگوں پر ظلم کروایا ہے جن کو اللہ تعالےٰ نے اپنی صحیح معرفت اور دوررس وعمیق نظر سے نوازا ہے، (جیسا کہ اصحاب کہف کے قصہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے) اور صرف حاضر وموجود پر ایمان، متاع عارضی اور سراب زندگی سے عشق، دنیا میں ہمیشہ رہنے وآرام کے سامان باقی رہنے کا یقین نیز ہر اس شخص کی تحقیر پر آمادہ کیا ہے جو اس سامانِ ظاہری میں تہی دست وکم مایہ تھا، جیسا کہ دو باغ والے کے قصہ میں گزرا ہے، کبھی یہ محدود علم انسانی ہر اس چیز پر استعجاب وحیرت پیدا کرتا ہے، جو پہلی نظر میں غلط یا عقل کے معیار اور مشاہدہ احساس کی میزان کے

خلاف معلوم ہوتی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ و خضرؑ کے قصہ میں بیان کیا گیا ہے،
کبھی یہ محدود، عاجز اور قاصر نگاہ خطا کر جاتی ہے، اور دور کو قریب اور مجاز کو حقیقت سمجھ لیتی ہے، جس طرح ذوالقرنین کو یہ محسوس ہوا کہ سورج ایک گندے چشمہ میں ڈوب رہا ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ[۵۱] — (اور پچھم کی طرف نکل کھڑا ہوا) یہاں تک کہ (چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچ گیا، وہاں اسے سورج ایسا دکھائی دیا، جیسے ایک سیاہ دلدل کی جھیل میں ڈوب جاتا ہے

یا جس طرح ملکۂ سبا کو شیشے کے محل میں داخل ہو کر یہ دھوکہ ہو گیا کہ اسکے فرش پر پانی بہ رہا ہے چنانچہ اس نے جلدی سے اپنے پائنچے چڑھا لئے۔

قِیْلَ لَهَا ادْخُلِی الصَّرْحَ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَیْهَا قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ[۵۲] — اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو، اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اترنے کے لئے اس نے اپنے پائنچے اٹھا لئے۔ سلیمانؑ نے کہا یہ شیشے کا چکنا فرش ہے

اس سورہ کا اختتام بھی اس کے آغاز و مقدمہ کے ساتھ ہم آہنگ و یک زبان ہے، اس میں بھی اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ کا علم انسان کے علم سے زیادہ عظیم اور یہ کائنات انسان کے تصور سے زیادہ کشادہ اور وسیع ہے،

---

۵۱ سورہ کہف۔ ۸۶

۵۲ سورہ نمل۔ ۴۴ (اس قصہ کی تفصیل سورہ نمل میں بیان کی گئی ہے)

اور اللہ تعالیٰ کے کلمات (اپنے وسیع مفہوم میں[۱]) انسان کے احاطہ سے باہر اور اس کی دسترس سے ماوراء ہیں، اور اگر سارے درخت قلم بن جائیں، اور سارے سمندر روشنائی میں تبدیل ہو جائیں[۲] تب بھی اس کے کلمات کو ضبط تحریر میں نہیں لا سکتے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ

(اے پیغمبر!) اعلان کر دے، اگر میرے پروردگار کی باتیں لکھنے کے لئے دنیا کے

---

[۱] علامہ آلوسی نے "روح المعانی" میں لکھا ہے کہ کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم و حکمت ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے عجائبات و اسرار ہیں، جب وہ انکو ظاہر کرنا چاہتا ہے تو ایک کلمہ "کن" سے ظاہر فرما دیتا ہے۔

[۲] علم جدید نے کائنات کی وسعت ستاروں کے باہمی فاصلوں، زمین سے ستاروں کی دوری روشنی کے سفر اور ایک ایک کہکشاں میں ستاروں کی تعداد، نظام شمسی کی کثرت سورجوں اور ستاروں کے حجم اور وزن، وہ عجیب و غریب اور نازک و لطیف قوانین فطرت اور اسباب جاذبیت جو اس عظیم کائنات میں جاری ہیں اور خلائے بسیط میں ان کے درمیان صحیح تناسب و ضروری توازن باقی رکھتے ہیں، اور اس زمین پر زندگی کی بقا کے ضامن ہیں نیز خشکی اور تری کے تناسب اور اسکے اثرات و فوائد پر جو روشنی ڈالی ہے وہ پہلے کسی کے خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی فلکیات کے دوسرے علوم و حقائق، علم الحیاۃ، علم تشریح، علم الحیوان، علم النبات اور دوسرے علوم و فنون اسکے علاوہ ہیں، یہ وہ علوم ہیں جن کا تصور اور خواب بھی ماضی میں مشکل تھا، علم کی ایک ایک شاخ پر پوری پوری لائبریری وجود میں آچکی ہے، اسکے لئے بہترین تجربہ گاہیں قائم کی جا چکی ہیں، اور یہ سب معلومات ان مجہولات کے علاوہ ہیں جن کا حصہ معلومات سے کہیں زیادہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انکے درمیان کوئی تناسب ہی نہیں

رَبِّیْ وَلَوْجِئْنَا بِمِثْلِہٖ مَدَدًا۔[1]

تمام سمندر سیاہی بن جائیں، تو سمندر کا پانی ختم ہو جائیگا، مگر میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہونگی، اگر ان سمندروں کا ساتھ دینے کے لئے ویسے ہی سمندر اور بھی پیدا کر دیں، جب بھی وہ کفایت نہ کریں

سورہ لقمان میں ہے:۔

وَلَوْاَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْۢ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ[2]

زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی، بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔

نبوت کی ضرورت اور نبی کا امتیاز

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ اگر یہ کائنات اپنی وسعت اور موجودات کی کثرت کی وجہ سے انسانی طاقت اور بشری صلاحیت سے باہر ہے، اور اگر اللہ تعالٰے کے کلمات کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے روئے زمین کے تمام درختوں کے قلم اور ساتوں سمندروں کی روشنائی ناکافی ہے، اور یہ سب چیزیں عقل انسانی

---

[1] سورہ کہف ۔ ۱۰۹ [2] سورہ لقمان ۔ ۲۷

اور علم انسانی سے ماوراء اور برتر و بالا ہیں تو پھر پروردگار کے عرفان اور اس کی صفات و آیات کے علم، زندگی کے معمہ کے حل، اور نجات و فلاح کے راستہ کی طرف رہنمائی کا آخر کیا طریقہ ہوگا؟ اور نبی کا جو خود بھی ایک بشر ہے دوسروں پر کیا امتیاز سمجھا جائے گا، جب کہ یہ بات ہم پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں کہ انسان کی عقل قاصر اور علم محدود ہے، ان سارے سوالات اور اشکالات کا جواب یہ آیت دیتی ہے، جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ ارشاد ہوا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ[۱]	(نیز) کہدے" میں تو اسکے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں البتہ اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ" تمہارا معبود وہی ایک ہے اسکے سوا کوئی نہیں"

یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ اس امتیاز و خصوصیت کا راز اور معرفت صحیحہ اور ایمان و عرفان کا سرچشمہ جس کے بغیر انسان کی فلاح و کامرانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا صرف "وحی الٰہی" ہے۔

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ[۲]	میں تو اسکے سوا کچھ نہیں کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ البتہ اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے۔

آخری بات

اللہ تعالےٰ اس سورہ کو آخرت کے ذکر، اس کی اہمیت کے اظہار اور اسکی

---

[۱] سورہ کہف ۱۱۰ [۲] ایضاً

دعوت و تبلیغ کو زندگی کی اساس اور ہر عمل کی بنیاد بنانے کی دعوت پر ختم کرتا ہے، یہاں بھی خاتمہ آغاز کے ساتھ مربوط اور اس روح کے ساتھ ہم آہنگ و ہم رنگ ہے، جو پورے سورہ میں جاری و ساری ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا۔ (سورہ کہف۔ ۱۱۰)

پس جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے، چاہئے کہ اچھے کام انجام دے اور اپنے پروردگار کی بندگی میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کرے (بس، اسکے سوا میری کوئی پکار نہیں!)
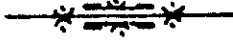
مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

کی چند اہم شاہکار تصنیفات

تاریخ دعوت و عزیمت مکمل (چھ حصے)
مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
منصب نبوت اور اُس کے عالی مقام حاملین
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک
تذکرہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ
تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات
تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں
نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں
جب ایمان کی بہار آئی
مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت
حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب
عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح
تزکیہ واحسان یا تصوف و سلوک
مطالعہ قرآن کے مبادی اصول
سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ
خواتین اور دین کی خدمت
کاروان ایمان و عزیمت
سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ

نبی رحمتؐ مکمل
حدیث کا بنیادی کردار
معرکۂ ایمان و مادیت
پرانے چراغ مکمل (دو حصے)
ارکان اربعہ
نقوش اقبال
کاروانِ مدینہ
قادیانیت
تعمیر انسانیت
حدیث پاکستان
اصلاحیات
صحبتے با اہل دل
کاروانِ زندگی مکمل
مذہب و تمدن
دستورِ حیات
حیات عبدالحیؒ
دو متضاد تصویریں
تحفۂ پاکستان
پاجا سراغ زندگی
عالم عربی کا المیہ

فون - 6600896

مجلس نشریاتِ اسلام، ناظم آباد مینشن - ۱-کے-۳-ناظم آباد نمبر ۱ کراچی ۱۸

اشاعت: مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی